ڈاکٹر وحید قریشی

ڈاکٹر وحید قریشی

سنگ میل پبلیکیشنز لاہور

۱۹۷۰ء

بار دوم : 1970

طابع : عبدالحمید چوھدری

مطبع : نیو کامران پرنٹرز ، لاھور

ناشر : نیاز احمد ، سنگ میل پبلی کیشنز ، لاھور

تعداد : ایک ھزار

قیمت : دس روپے

مولانا غلام رسول مہر کے نام

پیش لفظ

"نذر غالب" جناب ڈاکٹر وحید قریشی کے مقالات کا مجموعہ ہے۔ ان میں چند ایک تحقیقی مضامین اور متعدد تنقیدی جائزے شامل ہیں۔ کچھ ان میں سے مطبوعہ ہیں اور کچھ غیر مطبوعہ۔ ڈاکٹر وحید ادیب بھی ہیں اور ساتھ ہی بیشۂ تحقیق کے شیر مرد اور میدان تنقید کے شہسوار بھی۔ موخرالذکر دونوں اصناف تحریر میں متعدد کتابیں ان کے قلم سے نکل کر اہل علم سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں۔ حال ہی میں اُنہوں نے مجلس ترقی ادب کے سہ ماہی رسالہ "صحیفہ" کا غالب نمبر چار جلدوں میں مرتب کر کے غالب شناسوں میں نام پیدا کیا ہے۔ غالب کی برسی سے متعلق مطبوعات کا دلاویز سلسلہ بظاہر لامتناہی ہے۔ یہ سلسلہ غالب کی محبوب شخصیت اور اس کے پہلودار کلام کی معنی آفرینی پر دال ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب ایک سدا بہار باغ ہے جس کے لیے ہمیشہ داماں باغباں و کف گل فروش سراپا انتظار اور تجسس پسند دل و دماغ صحرا دستگاہ و دریا آشنا رہیں گے۔

تحقیقی مضامین میں ڈاکٹر وحید پہلے دیگر افاضل کے کام کا جائزہ لیتے ہیں اور پھر اپنی جچی تلی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر معروضی رہتا ہے۔ متوازن انداز میں موجودہ مواد کو کھنگال کر وہ زیر بحث تصنیف کی اندرونی

شہادتوں اور مسلمہ حقائق کو پیش نظر رکھ کر اپنے نتائجِ فکر پیش کرتے ھیں ۔ اس طرح سے موضوعی تاثریت سے اپنا پہلو بچاتے ھیں ۔ تنقیدی مضامین میں وہ تاریخی اور ثقافتی ماحول کے پس منظر میں زیر نظر تصنیف کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ھیں اور تخلیقی تجربہ کے پوشیدہ گوشوں پر روشنی ڈالتے ھیں ۔ اس نوع کے مضامین میں بھی ان کا نقطۂ نظر تاثراتی کم اور علمی زیادہ ھوتا ھے ۔ اس سطح پر لکھنے والے ھمارے ھاں کم ھیں ۔ مجھے اُمید ھے کہ اھل ذوق ان مقالات کی کماحقہ قدر کریں گے اور انھیں غالبیات میں ان کا صحیح مقام ملے گا ۔

۶۵ گلبرگ لاھور

۱۱ اگست ۱۹۶۹ء

ایس اے رحمٰن

ترتیب

عہد ابوظفر بہادر شاہ

عہد ابوظفر بہادر شاہ عجیب تضادات کا دور تھا ۔ چارلزڈ کنز نے اپنے ناول ''دو شہر ایک کہانی'' (A tales of two Cities) میں انقلاب فرانس کے وقت کا جو نقشہ آغاز کتاب میں کھینچا ہے اس زمانے کی حالت بھی اس سے مختلف نہ تھی ۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے آغاز کار سے لے کر اس زمانے تک اپنے تجارتی مفادات کے تحفظ کے لیے جو سائنسی غلبہ حاصل کر لیا تھا اس کے اثرات کلکتے سے نکل کر دلی اور اُس کے نواح کو بھی اپنی لپیٹ میں لے چکے تھے ۔ ۱۸۰۲ع میں لارڈ لیک کی دھلی میں آمد سے آل تیموری کا رہا سہا وقار بھی خاک میں مل گیا۔ ۱۸۱۳ء تک کمپنی کی تجارتی حکمت عملی نئی بنیادوں پر استوار ہو چکی تھی ۔ اس سے قبل برصغیر پاک و ہند میں کمپنی کی تجارتی اجارہ‌داری حصول دولت کے صرف دو ذرائع سے کام لیتی رہی، یا تو دولت کا کثیر حصہ نقد و جواھر کی صورت میں انگلستان میں منتقل ہوتا رھا' یا پھر دوسرا وسیلہ مقامی تجارت کی حوصلہ شکنی اور زراعت اور رفاہ عامہ پر کم سے کم روپیہ لگانے کی صورت میں ظاھر ہوتا رھا ۔ انگلستان میں صنعتی انقلاب کی تکمیل نے کمپنی کی تنہا اجارہ‌داری ختم کی اور ۱۸۱۳ع سے ۱۸۳۳ع تک کے درمیانی زمانے میں جب برطانوی صنعت‌کاروں نے پاک و ہند کی تجارت پر ہلہ بول دیا تو اب کمپنی کی تجارتی پالیسی واضح رنگ اختیار کر گئی ۔ اس نئی پالیسی کا اندازہ کچھ اس سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ۱۷۸۰ع اور ۱۸۵۰ع کے درمیانی عرصے میں برطانوی مال کی کھپت ۱۵۲ , ۳۸۶ پونڈ سے ۸٬۰۲۴٬۰۰۰ پونڈ تک بڑھ گئی ۔ برطانیہ کی کل برآمدات کے $\frac{۱}{۳۲}$ حصے کی بجائے $\frac{۱}{۸}$ حصے

صرف ہند و پاک کے لیے مخصوص ہوگئے[1] ۔ اس کا عملی نتیجہ یہ تھا کہ سیاسی اقتدار کے بل بوتے پر (جو اب کمپنی کو حاصل ہو گیا تھا) مقامی صنعتوں کو بزور کچلنے کی تحریک عام ہوئی ۔ یہاں سے جو چیز برآمد کی جا سکتی تھی وہ لے دے کر اب خام مال ہی ہو سکتا تھا ۔ اس خام مال کے اصل حلقے شہر نہ تھے دیہات تھے ۔ بدیسی حکومت کی توجہ دیہات کی طرف ہو گئی ۔ گویا برطانوی پالیسی کی بنیادی کڑی یہاں کی صنعتی ترقی نہیں زرعی پیداوار میں اضافہ قرار پائی ۔ اس دور کا جائزہ لیتے ہوئے علامہ عبداللہ یوسف علی لکھتے ہیں :

''ملک میں کاشتکاری اگرچہ بڑے پیمانے پر ہو رہی تھی لیکن ابھی تک ملک کے کسی حصے میں بلکہ بنگال میں بھی اس کا وہ زور شور نہ تھا جو بعد میں ہوا ۔ ہملٹن کا اندازہ ہے کہ بنجر زمین کو چھوڑ کر بنگال اور بہار میں صرف ایک تہائی زمین زیر کاشت تھی ۔ انگلستان میں چراگاہوں اور قابل کاشت اراضی کا اوسط فی کس ۲ ایکڑ تھا لیکن بنگال میں فی کس ایک ایکڑ سے کچھ زیادہ تھا ۔ آج کل بنگال میں فی کس نصف ایکڑ زیر کاشت اراضی بھی مشکل سے ہوگی ۔ اس دور میں دستکاریاں برطانوی مقابلے کے باعث روز بروز تباہ ہو رہی تھیں ۔ تھارنٹن کے زمانے میں ڈھاکے کی نفیس ململ اور بالاسور کے کپڑے کی وسیع دستکاریوں کا خاتمہ ہو چکا تھا ۔ جو صورت بڑے بڑے صنعتی مرکزوں میں پیش آئی وہی ملک بھر میں ہزاروں چھوٹے چھوٹے مرکزوں میں بھی ظاہر ہوئی ۔ دستی صنعت (جس میں نفیس مصنوعات اور روزمرہ کی ضروریات دونوں شامل ہیں) کو سخت نقصان پہنچا ۔ دستکاریاں روز بروز غیر ملکی تجارت درآمد کا واحد اجارہ بنتی گئیں ۔ لوگوں کی توجہ کاشتکاری کی جانب زیادہ ہوگئی ۔ ہندوستان زیادہ تر خام اشیاء پیدا کرنے کے قابل رہ گیا اور ان خام اشیاء کی پیداوار بھی

روز بروز غیر ملکی تاجروں کے ہاتھ میں جانے لگی "[۲]

پاک و ہند کی سماجی حالت پر اس کے دو بنیادی اثر پڑے ' اول یہ کہ یہاں کی آبادی کا بنیادی رخ شہروں کی بجائے دیہات کی طرف ہوگیا ۔ یا پھر ان شہروں کی جانب ہوا جو بندرگاہوں پر مشتمل تھے ۔ اس دور کے اعداد و شمار اس پر خاطر خواہ روشنی ڈالتے ہیں۔ ۱۸۲۲ء تک دلی کی آبادی گھٹ گھٹا کر ڈیڑھ لاکھ رہ گئی تھی (یعنی مرشد آباد کی آبادی کے برابر) ' اس کے مقابلے میں بمبئی کی آبادی ایک لاکھ ستر ہزار اور کلکتے کی پانچ لاکھ اور سورت کی ساڑھے چار لاکھ تک ہو گئی تھی ۔ دلی سے تو بنارس ہی غنیمت تھا کہ وہاں کی آبادی اب بھی چھ لاکھ نفوس پر مشتمل تھی[۳]۔ دوسرا بڑا اثر یہ ہوا کہ حاکموں کی توجہ دیہی آبادی اور زراعت کی طرف ہوگئی ۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ مسلم متوسط طبقہ جو تجارت کے راستے ۱۸۵۷ء کے بعد پوری طرح نمودار ہوا، اس زمانے میں اقتصادی دباؤ کے سبب معلق ہو کر رہ گیا ۔ بنگال میں تو پھر بھی متوسط ہندو طبقے کے لیے حالات کچھ بہتر تھے ۔ ہندو تاجروں اور بنیوں نے کاروبار پر تسلط حاصل کرنا شروع کر دیا تھا ۔ اقتصادی تغیرات نے دانش و فرہنگ میں بھی نئے مزاج کے لیے راستہ صاف کیا ۔ اس فضا میں ۱۸۲۸ء میں برہمو سماج جیسی تحریکیں وجود میں آنے لگی تھیں ۔ جس سے فکر و نظر کی تبدیلی کا کچھ احساس ہوتا ہے ۔ لیکن نئے متوسط طبقے کی اصل دوڑ تو ملازمتوں کے حصول تک ہی محدود تھی ۔ ظاہر ہے کہ مقامی باشندوں کو اس زمانے میں لے دے کر ادنٰی درجے کی ملازمتیں ہی میسر آ سکتی تھیں ۔ ۱۸۱۹ء میں جب فوج کی تخفیف سے دس لاکھ فوجی برطرف ہوئے تو اس سے اس طبقے کی اقتصادی بدنصیبی کا قیاس کیا جا سکتا ہے ۔ دلی اور اس کے گرد و نواح میں تو مسائل کچھ زیادہ ہی پیچیدہ تھے ۔

دلی کی آبادی، خوشحالی اور خوراک کا دار و مدار آس پاس کے دیہات اور دوآبہ کی زرعی پیداوار پر تھا۔ چنانچہ سلطانی دور میں اس علاقے کی آب پاشی کے ذرائع کو بہتر بنانے کے لیے مسلسل مساعی ہوتی رہیں۔ آل تیموری کے زمانے میں بھی ان علاقوں کی پیداوار دوسرے علاقے کے مقابلے میں بہتر رہی۔ اورنگ زیب عالمگیر کے دور حکومت میں دکنی سہمات نے برصغیر کے اقتصادی نظام کو شدت سے متاثر کیا، جنگی اخراجات بڑھ گئے، اس کا بوجھ بالآخر کسانوں اور زراعت پیشہ افراد پر آ پڑا۔ حکومت کا ایک اقدام بہر حال دور رس نتائج کا سبب بنا؛ علماء نے حکومت کے نرخ مقرر کرنے کی پالیسی کو بوجوہ ترک کرا دیا۔ جس سے نفع اندوزی کے کچھ نئے راستے کھل گئے۔ ڈاکٹر اشرف لکھتے ہیں:

"منافع اندوزی کے بارے میں اورنگ زیب کے عہد میں علمائے اسلام نے کیا کیا؟ اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ ان حضرات نے حکومت سے نرخ مقرر کرنے اور نرخ نامہ شائع کرنے کا دستور بند کرا دیا۔ اور دلیل یہ دی کہ یہ طریقہ از روئے شرع بیع و شرع کی آزادی میں دخل اندازی ہے اور اس لیے مکروہ ہے"۔ [۳]

اس اقدام کا نتیجہ عالمگیر جیسے اعلیٰ منتظم کے زمانے میں تو نمودار نہیں ہو سکتا تھا لیکن آگے چل کر اس کی اولاد کے عہد حکومت میں اشیاء کی قیمتوں کے بڑھنے اور گراں فروشی کے رجحان کے فروغ پانے کی صورت میں ہوا۔ عالمگیر کے کمزور جانشینوں نے جہاں اور خرابیوں کو تقویت دی وہاں اشیائے خورد و نوش کی کمیابی اور گرانی نے دلی کی تباہی میں ایک فعال عنصر کے طور پر کام کیا۔ اس سے زندگی کے عام معیار اور معاشرتی خواہشات و عزائم کے درمیان 'بعد بھی پیدا ہوا۔ طبقہ امراء کے آدرشوں کا تعلق حقیقی زندگی سے کچھ نہ رہا۔ قرون وسطیٰ کی اخلاقی، تمدنی، مذہبی اور

ادبی اقدار فضا میں رچی بسی موجود تھیں لیکن ان کا تعلق گرد و پیش سے کٹ چکا تھا ۔ اس افتراق نے تضادات کو جنم دیا ۔ نظریے اور عمل کا درمیانی فاصلہ کئی سماجی اور ادبی پیچیدگیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوا ۔ لوگ اخلاق اور سماجی اقتدار کو اصولی طور پر تسلیم کرتے تھے لیکن عملی زندگی میں یہ قدریں مفقود ہو چکی تھیں ۔ اس تضاد نے معاشرتی زندگی میں دو طرح کے گروہ پیدا کر دیے تھے ؛ ایک وہ جو مٹتی ہوئی قدروں کے ترجمان تھے ، زندگی کی حقیقتوں سے روگردانی کر کے یا تو مسائل کی مثالی اور فرضی صورتوں میں دلچسپی لیتے تھے یا پھر فروعی اور ضمنی حقائق کو زندگی کے بنیادی حقائق مان کر ماحول سے اپنا تعلق کمزور کر لیتے تھے ، دوسری طرف کچھ ایسے ادیب بھی تھے جو حقائق کو دیکھتے تھے اور ان تبدیلیوں کو محسوس کرتے تھے جو ان کے آس پاس وقوع پذیر ہو رہی تھیں۔ شعراء کا پہلا گروہ اکثر تذکیر و تانیث کی بحثوں میں الجھتا تھا اور زبان و بیان کے سانچوں ہی کو ادب کا بنیادی مقصد جانتا تھا ۔ ان کے نزدیک زندگی کے خیالی اور مثالی نقشے ہی سب کچھ تھے۔ اگر کبھی یہ لوگ زندگی کی تصویر کشی کرتے بھی تھے تو وہ حقیقی زندگی نہ تھی بلکہ اس کا سطحی اور کھوکھلا روپ تھا ۔ ایسے میں ان شعراء کے کلام میں زندگی کی جو تصویر ابھرتی ہے اس میں حقیقت کی محض پرچھائیاں ملتی ہیں حقیقی خط و خال نظر نہیں آتے ۔ یہی سبب ہے کہ ذوق کے قصیدوں کا 'بادشاہ' ظل سبحانی' کائنات کا حکمران اور شان و شوکت منبع ہے لیکن تاریخ اس فرمانروا کا جو نقشہ پیش کرتی ہے اس میں یہ انگریزوں کا تنخواہ دار اور چند لاکھ روپے سالانہ پانے والا حاکم ہے جس کا اقتدار لال قلعے کی چار دیواری میں محدود ہے ۔ سلطنت کا کاروبار لارڈلیک کے حملہ دہلی کے بعد سے عملاً انگریزوں کے ہاتھ میں منتقل ہو چکا ہے ۔ استاد شاہ کی تنخواہ چار روپے ماہوار

سے چل کر تیس روپے ماہوار تک پہنچتی ہے — یہ تھے خاقانی ہند اور یہ تھے ان کے ممدوح ۔

۱۸۰۲غ سے ۱۸۷۵ع تک یکے بعد دیگرے شاہ عالم ثانی ، اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر فرمانروا ہوئے ۔ انگریزوں کے ساتھ ہر نئے معاہدے نے اقتدار کا کچھ نہ کچھ حصہ مغل فرمانرواؤں سے چھین لیا تا آنکہ دہلی کا ریذیڈنٹ اصل حکمران ہوگیا اور بہادر شاہ ظفر کا اقتدار محض کاغذی اقتدار قرار پایا ۔ ان حالات میں شہنشاہ عالم بھی ایک جذباتی تضاد کا شکار تھے ، ان کی پنشن انگریزوں کے نقطۂ نظر سے محض ایک تنخواہ تھی لیکن مغلیہ فرمانروا اُسے خراج سمجھنے پر مجبور تھے ۔ بادشاہ کی مالی حالت بھی اتنی کمزور تھی کہ دیوان عام کی صفائی تک کا معقول انتظام ممکن نہ تھا ۔ خلعتیں اور داد و دہش کی وہ تصویریں جو اس دور کے ادب میں ملتی ہیں خاصی مبالغہ آمیز ہیں ۔ یہ مبالغہ آرائی اس دور کے ادب کا ایک بنیادی رجحان ہے ۔ اس لحاظ سے زندگی کی جو تصویریں ہمیں ذوق اور اس کے ساتھیوں کے ہاں ملتی ہیں ان میں مبالغہ، خیال آفرینی، زبان سے دلچسپی اور اسی طرح کے دوسرے لوازم پائے جاتے ہیں ۔ تخلیقی لگن جب خارجی زندگی سے رشتہ توڑتی ہے تو اصل حقائق کی جگہ سلیقہ اور فن لے لیتا ہے ۔ زندگی سے ایسے شاعروں کا رشتہ کمزور اور بالواسطہ ہوا کرتا ہے ۔ یہی کمزور رشتہ ان شعرا کا خاصہ ہے ۔ ذوق اور ظفر کے ہاں کبھی کبھی لیک چزینہ لے بھی ابھرتی ہے لیکن اس کا آخری سہارا اخلاقی قدروں سے لگاؤ کی صورت میں رونما ہوتا ہے ۔ یہ شاعری پنچائتی رنگ بھی اُختیار کرتی ہے لیکن اپنے جذبات سے خوف زدہ ہو کر دوسروں کے جذبات کی ترجمانی کچھ زیادہ نتیجہ‌خیز ثابت نہیں ہوتی ۔ چاہے وسط ایشیائی روایات سے کنی کاٹ کر مقامی رنگ

اختیار کیا جائے، یہ تبدیلی اپنے نتائج کے اعتبار سے، ادھوری اور ناقص ثابت ہوتی ہے۔ شعراء کے اس گروہ کے مقابلے میں دوسرا گروہ بھی ہے جس میں غالب پیش پیش ہیں ۔

۱۸۵۷ء سے بہت پہلے معاشرتی قدروں میں تبدیلی کا عمل آہستہ آہستہ شروع ہو چکا تھا - ۱۸۵۷ء تو ایک واضح حد ہے جس کے بعد جدیدیت کی رو تیز ہوتی ہے مشاہدے اور تجربے پر زور دیا جاتا ہے اور قرون وسطیٰ کے بنے بنائے تصورات قصۂ پارینہ ہونے لگتے ہیں ۔ ذاتی مشاہدے کو رسمی تجربے اور رسمی انداز سے الگ کیا جانے لگا ۔ زبان کی بجائے سواد اہم ہوگیا اور شاعری دوسرے شاعروں کے اشعار سے تحریک حاصل کرنے ، روائتی ذخیرۂ الفاظ کا سہارا لینے ، روائتی سانچوں کو بیان کرنے کی بجائے انفرادی تجربے کی اہمیت پر زور دیا جانے لگا ۔ خیالی اور مثالی تصورات کی جگہ زندگی کی اصل حقیقتیں موضوع شعر بننے لگیں ۔

۱۸۰۲ء کے بعد سے پاک و ہند کی سماجی زندگی میں دو رحجان متوازی چلنے لگتے ہیں ۔ اس صورت حال کی وضاحت کے لیے اس دور کے کچھ اقتصادی حالات کا جائزہ بھی ضروری ہے ۔

دلی کی اقتصادی حالت عالمگیر کے انتقال (۱۷۰۷ء) کے بعد بتدریج خراب ہوتی چلی گئی ۔ محمد شاہ کے عہد حکومت میں دارالحکومت کو نادر شاہ کے حملے کا سامنا کرنا پڑا ، پھر اس کے جانشینوں کے عہد میں دلی پر احمد شاہ ابدالی، جاٹ، مرہٹے پے در پے حملہ آور ہوتے رہے، قتل و غارت ؛ جنگ کا خوف اور مالی ابتری نے امراء و شعراء کو نقل مکانی پر مجبور کر دیا ۔ مرکزی حکومت کی گرفت دور دور کے صوبوں پر کمزور پڑتی چلی گئی ، اسی نسبت سے حکومت کی آمدنی بھی کم ہوتی گئی ۔ شاہ عالم ثانی کے عہد حکومت میں تیموری حکمرانوں کا رہا سہا وقار بھی مٹ

گیا ۔ غلام قادر رہیلے کا ظلم و ستم ، مرہٹوں کی حکومت میں شرکت اور بالآخر لارڈ لیک کی آمد سے کمپنی کے اقتدار کا چراغ روشن ہوا ۔ اب شہنشاہ ہند کی حکومت کا اصل حلقہ قلعۂ معلیٰ تک محدود رہ گیا ۔ قلعے سے باہر نام اسی کا چلتا تھا لیکن اصل اقتدار کمپنی اور اس کے کارندوں کے ہاتھ میں تھا ۔ دلی اور اس کے نواح کا انتظام و انصرام ۱۸۰۲ء سے پہلے پوری طرح درہم برہم ہو چکا تھا ۔ بقول مورلینڈ امراء تو اکبر کے زمانے ہی میں عیاشیوں میں ڈوبے ہوئے تھے ، انہیں روپے کی ضرورت تھی اور اس کے لیے کسانوں پر سختی کی جاتی تھی ۔ زراعت کو بہتر بنانے اور پیداوار کو بڑھانے کی فکر کسی کو نہ تھی ۔ ہر امیر اپنے شاہانہ ٹھاٹھ کے لیے روپے کا دست نگر تھا اور رعایا کے بہبود کا خیال قصۂ ماضی ہو چکا تھا ۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ قسمت آزما اُمراء بھی دولت سمیٹنے میں لگے ہوئے تھے اور رعایا میں سے بھی جس کا بس چلتا من مانی کرتا تھا ۔ چنانچہ متھرا اور دہلی کے درمیان کا علاقہ شاہی آمد و رفت کے لیے بھی غیر محفوظ ہوگیا تھا ۔ انگریزوں کے قبضۂ دہلی کے بعد پہلے دو چار برس تو کمپنی کے افسروں کو مدافعت ہی میں بسر کرنے پڑے ۔ مرہٹوں (خصوصاً ہلکر) کے حملوں کا مقابلہ بہرحال ضروری تھا ۔ ایسے میں زراعت اور افراد کی بہبود پر کون توجہ کرتا ۔ ایک لحاظ سے ابھی تک صرف اتنا فرق پڑا تھا کہ امراء کی جگہ کمپنی کے ملازموں نے لے لی تھی۔ یہ مالیے کی وصولی بھی اسی ظالمانہ طریق پر جاری رہی لیکن ۱۸۰۶ء سے دلی کے نواحی علاقوں میں امن و امان کی بحالی اور زراعت کی بہتری کی طرف توجہ کی جانے لگی ۔ مسٹر سیٹن اور اس کے نائبؑ چارلز مٹکاف (Charles Metcalfe) کی کوششوں سے دلی کو ایک بار پھر امن کا سانس نصیب ہوا[۵] اس وقت دلی کی جو حالت تھی اس کا نقشہ مٹکاف کے الفاظ میں یہ ہے :-

When the force at Delhee was not sufficient to keep in awe the neighbouring villages; when the Resident's authority was openly defied within a few miles of that city; when the detachment was kept on the alter by bodies of armed villagers manacing the pickets, and when Sepoys who strayed were cut to pieces; when every village was a den of thieves, and the city of Delhee was parcelled out into shares to the neighbouring villages, of which each co-partnership monopolised the plunder of its allotted portion; when a company of infantry was necessary to attend the officer making the revenue settlement, and even that force was threatened with destruction, and taunted with menace of having its muskets taken as play...things for the villagers' children; when to realise a single rupee of the settlement then concluded, purposely concluded on the lightest terms, it was necessary to employ a battalion of infantry with guns, when to subdue a single unfortified village a force of five battalions with cavalry and artillery was deemed necessary, and when the villagers, instead of awaiting the assault sallied forth against this force, and for an instance staggered the advancing columns with the briskness of their attitude......if that gentleman had been at Delhee in those days he would probably have been more indulgent towards a system which had brought the Delhee territory into the state in which it was at the end of 1818..........[6]

دلی میں امن و امان قائم رکھنے کے لیے نظم و ضبط کو بحال کیا گیا ۔ خفیہ خبر رسانی کے طریق کار اور عدالتی نظام کے استحکام سے دلی شہر میں رعایا کے دل سے لٹنے اور ذلیل ہونے کا خوف جاتا رہا ۔ انگریز ریذیڈنٹ شہر کا افسر اعلیٰ تھا ، اس کا نائب شہر کی عدالتوں کا جج ہی نہیں ، شہر کی پولیس کا حاکم اعلیٰ بھی تھا ۔ گویا ریذیڈنٹ کی ذات میں شہر کے اندر قاضی اور کوتوال کی حیثیت اور شہر سے باہر صوبہ دار کے مناصب جمع تھے۔ ۱۸۰۷ع میں بیرونی یورشوں کی روک تھام کے علاوہ زمینداروں کے ڈاکے اور لوٹ مار سے بچاؤ کی تدبیریں بھی کی گئیں ۔ ۱۸۰۷ع میں زرعی

بندوبست کیا گیا اس کے بعد پے در پے اس پر نظر ثانی ہوتی رہی۔ زراعت کی طرف توجہ کرنے سے آبادی کا رخ شہر سے دیہات کی طرف ہوگیا۔ یہ عرض کرنا بھی بے موقع نہ ہوگا کہ کمپنی کی زرعی اصلاحات میں جہاں خوبیاں تھیں وہاں دو بڑی خرابیاں بھی تھیں: پہلی خرابی تو یہی تھی کہ اب لگان جنس کی بجائے نقد لیا جانے لگا اور اس کی وصولی میں سختی کی جانے لگی، لگان کی شرح بھی خاصی زیادہ رکھی گئی۔ دوسرے بنیوں کا درمیانی واسطہ ختم کر دیا گیا۔ کسانوں کو بنیوں کی ہنڈیوں سے بعض اوقات قحط سالی کے دنوں جو مدد مل سکتی تھی وہ ختم ہوگئی اور حکومت کسی ایسی مدد کی فی الحال ضمانت نہیں دے سکتی تھی۔ مزید خرابی یہ تھی کہ بیگار کا دستور بھی قائم رہا اس سارے نظام میں خوبی کی بات صرف یہ تھی کہ اب نواحی دیہات میں مقدم کو اپنے اپنے علاقے میں امن کا ذمہ دار بنا دیا گیا اور شیرشاہ کے زمانے کا طریق کار رائج کر کے جرائم کو ختم کیا گیا۔ (اسی طرح شہر دہلی میں خاک روبوں کی مدد سے خفیہ اطلاعات کی وصولی کا نظام چلایا گیا اور اہل شہر کے لیے اب زندگی بسر کرنا آسان ہوگیا۔) دیہات میں لوٹ مار اور قتل و غارت میں خاطر خواہ کمی ہوئی۔ روحانی قدروں سے زیادہ اب عوام کی توجہ مادی مسائل کی طرف ہوگئی۔

ایک طرف قرون وسطیٰ کی قدریں تھیں اور دوسری طرف جدید دور کے مسائل اور جدید دور کی ضروریات۔ اس دور کا انسان اسی دوراہے پر کھڑا تھا۔ قدیم اخلاقی ضابطے، قدیم فلسفیانہ افکار، قدیم رسم و رواج، قدیم آداب معاشرت ایک طرف — اور دوسری طرف ابھرتی ہوئی اور ترقی کرتی ہوئی قوموں کے نظریات اور عقائد تھے۔ پوری معاشرتی زندگی دو دھاروں میں بٹی ہوئی تھی۔ جہاں معاشرے میں دو رجحان متوازی چل رہے تھے وہاں شعر و ادب میں

بھی دو تحریکیں ساتھ ساتھ چلتی دکھائی دیتی ۔ ہیں اس فضا میں لسانی تحریک کا رحجان زیادہ قوی ہے ۔ سبب شاید یہ ہے کہ مٹتی ہوئی تہذیبی قدروں کا نقشہ جس کا کچھ حصہ حقیقی اور کچھ مثالی تھا زیادہ واضح تھا ۔ اس کے مقابلے میں جو تبدیلی معاشرتی زندگی میں ظہور پذیر ہو رہی تھی اس نے فی الحال کوئی واضح شکل اختیار نہیں کی تھی ۔ اس لیے غالب اور اس کے ساتھیوں کی جدیدیت اس جدیدیت سے مختلف ہے جس کی علم بردار سر سید کی تحریک ثابت ہوئی ۔ معاشرتی زندگی میں جو تبدیلیاں آ رہی تھیں وہ بہت آہستہ رونما ہو رہی تھیں ۔ نیا ابھرتا ہوا متوسط طبقہ ابھی زندگی کی دوڑ میں کامیاب نہیں ہوا تھا اس لیے اس کے عزائم کی جھلک سرسید کی تحریک کے ساتھ ہی نظر آتی ہے لیکن ماضی پرستی کی بجائے حال کی اہمیت کا احساس بہر حال ہو ہی چکا تھا ۔ مابعدالطبیعاتی مسائل سے زیادہ دنیا داری کے مسائل اہم ہو رہے تھے ۔ عشق و محبت کے تجربات میں قرون وسطیٰ کے بنے بنائے سانچے کام میں نہیں آ سکتے تھے ۔ محبوب کا مثالی نقشہ اور مناسبات و متعلقات شعری کا بنا بنایا نظام نئے طرز احساس کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا ۔ روحانی تجربات کی جگہ مادی زندگی کی برکتیں معاشرے کے ایک طبقے کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھیں ۔ اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کا خیال اور نئے حالات سے مطابقت پیدا کر کے مادی ترقی کے راستے پر چلنے کا خیال رفتہ رفتہ آدرش کی شکل اختیار کرنے لگا تھا ۔ زندگی کی اس تگ و دو نے ابھی شعوری سطح پر سوسائٹی کو بیدار نہیں کیا تھا اس لیے جذباتی زندگی کے وسیلے ہی سے شاعروں نے تبدیلی کا احساس خفی کیا ۔ مقصدیت اور اصلاح کا دور دورہ تو ۱۸۵۷ء کے بعد ہی ممکن تھا لیکن روحانی ترقی کی جگہ مادی ترقی، قسمت پر شاکر رہنے کی بجائے تگ و دو اور بے عملی کی جگہ عمل نے لے لی تھی ۔ اقتصادی ترقی کے جلو میں فرد کی ذات اہم

ہو گئی تھی۔ سماجی زندگی کے تجربات اور گزشتہ ادوار کے سماجی تصورات کے درمیان فاصلہ پیدا ہو چکا تھا۔ نظریے اور عمل کا درمیانی خلا غیر شعوری طور پر شاعروں کو کسی نئی منزل کی طرف جانے پر مجبور کر رہا تھا۔ شعراء کے پہلے گروہ نے اس کا احساس بہت ہی کم کیا، دوسرے گروہ نے اپنے آپ کو اس مثبت اقدام کے لیے آمادہ کیا۔ غالب کی شاعری کی فکری سطح، اس کی انفرادیت، سماجی قدروں کے سلسلے میں اس کا معاندانہ اور بعض اوقات احتجاجی رویہ، عشق و محبت کے تجربات میں ذاتی مشاہدے پر اصرار، زبان و بیان کے بنے بنائے سانچوں سے گریز، عشق و محبت کے بندھے ٹکے معیاروں کی خلاف ورزیاں ایک روحانی اضطراب اور ایک جذباتی طوفان کا پتا دیتی ہیں۔

حالی اور ان کے ساتھیوں نے جس زندگی کی تصویر کشی کی وہ غالب کے دور کی زندگی سے بہت آگے اور مادی لحاظ سے زیادہ مکمل ہے۔ غالب اور ان کے ساتھی جس تبدیلی کے داعی ہیں، وہ تبدیلی ہے، انقلاب نہیں۔ اس کے مقابلے میں حالی اور ان کے ساتھیوں نے جو کچھ کیا وہ انقلابی اقدام تھا۔ غالب اور ان کے ساتھی مستقبل کے عزائم کے بارے میں کوئی واضح نقش نہیں رکھتے تھے اس لیے ان کی جدیدیت ایک ذہنی تبدیلی کو ظاہر کرتی ہے۔ غالب ان معنوں میں جدید نہیں ہیں جن معنوں میں حالی جدید ہیں۔ اور یہی حال ان کے گروہ کے دوسرے شاعروں کا ہے جن میں مومن کا نام خاص طور پر لیا جا سکتا ہے۔ غالب کے دور کے تضادات قدیم و جدید کے تصادم سے جنم لیتے ہیں۔ انہیں قدیم اقدار کے مٹنے کا احساس ہے اور اس کی جگہ نئی زندگی کی آمد کی توقع ہے۔ نئی قدریں ابھی وجود میں نہیں آئی تھیں لیکن ان کے قدموں کی چاپ تو آمد آمد کا اعلان کر رہی تھی۔

عہد ابوظفر بہادر شاہ کی دلی، اکبر اور عالمگیر کے زمانے کی دلی سے مختلف تھی۔ یہ دلی تو محمد شاہ کے زمانے کی بارونق دلی سے بھی مختلف تھی۔ یہاں تیموری شان و شوکت نہیں اس کی پرچھائیاں باقی تھیں۔ یہاں روحانی قدریں بھی زندگی پر اب وہ گرفت نہ رکھتی تھیں جو مثلاً خواجہ میر درد کے زمانے کے تصوف کو حاصل تھیں۔ اب تو زندگی کا چلن ہی بدل گیا تھا۔ ایک طرف زندگی کے معیار تھے، دولت اور عیش و عشرت کے منصوبے تھے، زندگی بسر کرنے کا ایک فن تھا — اور دوسری طرف دلی کی بربادشدہ گلیاں تھیں، ظل سبحانی کا سایہ تھا، دولت کی قلت تھی، مادی وسائل کی کمی تھی، ایک ہاری ہوئی آبادی کا خاموش نوحہ تھا — یہ تھی غالب کے زمانے کی دلی، ابوظفر بہادر شاہ کی دلی، ذوق کی دلی، شاہ نصیر کی دلی!

حواشی

۱ - *Articles on India* (Karl Marx) *INT.* (R. P. Dutt) - Page 8.

۲ - انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ (عبداللہ یوسف علی) ص ۲۱۲ - ۲۱۳

۳ - ایضاً - ص۲۱۲ (جہاں اعداد و شمار کی پوری فہرست درج ہے)

۴ - ہندوستانی مسلم سیاست (ڈاکٹر محمد اشرف) ص۱۲۲

۵ - اٹھارھویں صدی عیسوی تک دریائے جمنا کے دونوں پہلوؤں سے نکلی ہوئی نہریں دھلی اور نواح دھلی کے علاقے کو سیراب کرتی تھیں لیکن نادری حملے کے بعد (۱۷۴۰ع) ایک نہر پٹ گئی ۱۷۵۳ء میں دوسری بھی بند ہو گئی - احمد شاہ ابدالی کے حملے کے بعد تو آب رسانی کا سلسلہ بالکل ھی منقطع ھو گیا - مٹکاف کا ایک کارنامہ قدیم نہروں کو دوبارہ صاف کر کے جاری کرنا بھی تھا - آخر ۱۸۱۰ع میں اس معاملے پر غور کیا گیا اور ۱۸۱۵ء سے نہری نظام بحال ھوا - (*Twilight of the Mughuls*, P. Spear, p. 104) اس کا فوری اثر یہ ھوا کہ کاشتکاروں کی پیداوار بڑھ گئی - اب اسی نسبت سے لگان بھی بڑھایا گیا لیکن چند برس میں لگان کی زیادتی اور قحط سالی نے پھر حالت بدل دی - (ایضاً ص۱۰۵) اس کا نتیجہ یہ ھوا کہ فکرو نظر کا انقلاب (جو ۱۸۵۷ع کے بعد رونما ھوا) اس کی آمد کی رفتار خاصی سست پڑ گئی -

6. *Twilight of the Mughuls*, P. Spear, p. 85, 86.

غالب اور نسخۂ شیرانی

کلام غالب کی تدوین کا کوئی جائزہ دیوان غالب اردو کے دو قلمی نسخوں کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا، اول نسخۂ بھوپال جسے قاضی انوارالحق ابن مولانا عبداللہ ٹونکی نے متداول دیوان غالب اور بعض دیگر اشعار کے اضافے کے ساتھ ۱۹۲۳ء میں بھوپال سے شایع کر دیا اور شایع شدہ نسخہ عام طور پر نسخۂ حمیدیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، دوم پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور کا وہ قلمی مخطوطہ جو ذخیرۂ شیرانی میں ہے[۱] اور ۱۹۴۲ء سے قبل مشہور محقق حافظ محمود شیرانی کی ملکیت تھا۔ ان دونوں نسخوں کا علم غالب شناسوں کو ایک مدت سے ہے۔ نسخۂ بھوپال کی اشاعت کے بعد اول اس کی بنیاد پر نیز رامپور کے ایک قلمی نسخے غالب کے خطوط اور کچھ دیگر مواد کے سہارے اول کلام غالب کو تاریخی ترتیب سے مرتب کرنے کا خیال سید عبداللطیف پی ایچ ڈی پروفیسر ادبیات انگلیسی عثمانیہ یونیورسٹی کو آیا اور انہوں نے غالب پر نومبر ۱۹۲۸ء میں ایک کتاب لکھنے کے علاوہ دیوان غالب کو تاریخی ترتیب سے شایع کرنے کا کام شروع کیا، جو ناتمام رہ گیا[۲]۔ سید عبداللطیف نے اپنے طریق کار کی نشاندھی Galib-A Crtical Appreciation of his life and Urdu Poetery میں کی ہے[۳] اس سے متاثر ہو کر ایس ایم اکرام صاحب نے غالب نامہ کی داغ بیل ڈالی اور اس کی اشاعت اول کے آخر میں کلام غالب کو ترتیب وار درج کرنے کے کام کو ایک معین شکل دینے کی کوشش کی غالب نامہ پہلی بار دسمبر ۱۹۳۶ء میں شایع ہوا تھا[۴]

(1)

غالب نامے کی طباعت اول میں اکرام صاحب کے سامنے نسخۂ شیرانی نہیں تھا۔ نسخہ شیرانی کو انہوں نے سب سے پہلے ۱۹۳۹ء میں استعمال کیا۔ اس لحاظ سے شیخ صاحب غالب شناسوں میں پہلے آدمی ہیں جن کی رسائی اس نادر قلمی نسخے تک ہوئی۔ غالب نامہ کی اشاعت سوم کے حصہ دوم یعنی ارمغان غالب کا اقتباس اہم ہے۔ فرماتے ہیں :

''غالب نامہ کی پہلی اشاعت کے وقت ہم نے دیوان غالب اردو طبع اول (مملوکہ خان بہادر سید ابو محمد صاحب)، قلمی نسخۂ میخانۂ آرزو (بانکی پور لائبریری) قلمی نسخہ دیوان فارسی (رامپور لائبریری) نسخۂ حمیدیہ اور تذکرۂ گلشن بے خار سے خاص طور پر استفادہ کیا ہے۔ دوسری اشاعت کے لیے قلمی نسخہ دیوان اردو (مملوکہ حافظ محمود خان صاحب شیرانی)، دیوان اردو طبع ثانی (۱۸۴۷ء) اور دیوان فارسی طبع اول (۱۸۴۵ء) سے مدد لی تھی اور اب ان مآخذ کے علاوہ رام پور کے اس قلمی نسخے سے مدد لی ہے جس کے شروع میں منتخب اردو دیوان سے دیباچہ کی تاریخ تحریر ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۸ھ درج ہے۔ ان سب سے مستفید ہونے کے بعد ہم نے کلام غالب کو مندرجہ ذیل پانچ دوروں میں ترتیب دیا ہے۔

پہلا دور ۱۸۰۷ء — ۱۸۲۱ء

اس دور میں ان اشعار کا انتخاب ہے جو پچیس (۲۵) برس کی عمر سے پہلے لکھے جا چکے تھے اور نسخۂ حمیدیہ کے متن میں موجود ہیں۔ ہم نے ان اشعار کو تمام کا تمام درج کرنے کے بجائے فقط انتخاب دینے پر... اکتفا کی ہے...

دوسرا دور ۱۸۲۱ء — ۱۸۲۷ء

اس ضمن میں وہ اردو اشعار ہیں جو نسخۂ حمیدیہ کے متن میں درج نہیں، لیکن اس قلمی نسخے میں موجود ہیں جو پروفیسر شیرانی کے کتب خانے کی زینت ہے۔ اس نسخے پر تاریخ کتابت درج نہیں لیکن داخلی شہادت کی بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ نسخہ مرزا کے سفر کلکتہ (۱۸۲۶ء) سے کچھ پہلے لکھا گیا۔ اور مرزا کی وہ غزلیں جو اس سفر کے دوران میں لکھی گئیں، اس نسخے کے حاشیے پر درج ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ دہلی یا لکھنؤ میں کوئی صاحب تھے جنہیں مرزا اثنائے سفر میں اپنا کلام بھیجتے رہے۔ حاشیے کی دو غزلوں کے متعلق تصریح ہے کہ وہ باندہ سے بھیجی گئیں۔ ان دو غزلوں کے مطلعے درج ذیل ہیں:

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاق نسیاں کا

اور

آبرو کیا خاک اس گل کی جو گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگ پیراہن جو دامن میں نہیں

ان میں سے پہلی غزل کے ساتھ "از باندہ فرستادند" اور دوسری سے پہلے "از باندہ رسید" لکھا ہوا ہے۔ اس طرح قیام لکھنؤ کی ذیل کی اردو غزل بھی اس نسخے کے حاشیے پر موجود ہے:

واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو
صد رہ آہنگ زمیں بوس قدم ہے ہم کو

اس قلمی نسخے کے متعلق ابھی مزید تحقیق اور غور و خوض کی ضرورت ہے اور شاید بالآخر یہ فیصلہ کرنا پڑے گا

کہ اگرچہ اس نسخے میں ۱۸۲۷ع سے پہلے کے قریب قریب سب اشعار درج ہیں لیکن اسے پھر بھی اس زمانے تک کے اشعار کا مکمل مجموعہ نہیں کہا جا سکتا ۔ اس کے بیچ اور آخر کے چند ورق غائب ہیں اس کے باوجود اس میں شک نہیں کہ یہ نسخہ کلام غالب کی تاریخی تدوین میں بڑا کارآمد ہے اور اس کی مدد سے اس زمانے کے اشعار بہت حد تک معین ہو سکتے ہیں جب مرزا اردو چھوڑ کر فارسی کو اپنی زبان شعر و سخن بنا رہے تھے '

تیسرا دور ۱۸۲۷ع — ۱۸۴۷ع

اس دور کے فارسی اشعار کو ہم نے تین مختصر دوروں میں تقسیم کیا ہے :

(الف) لالۂ صحرا ۱۸۲۷ع سے ۱۸۳۰ع تک... (جو) سفر کلکتہ کے دوران میں کہے گئے ۔

(ب) گل رعنا ۔ ۱۸۳۰ع سے ۱۸۳۸ع تک...جو غالباً سفر کلکتہ کے بعد لکھے گئے' لیکن قلمی نسخہ بانکی پور لائبریری (۱۸۳۸ع) میں موجود ہیں ۔

(ج) بادۂ شیراز ـ ۱۸۳۸ع سے ۱۸۴۷ع تک...جو قلمی نسخہ بانکی پور کے بعد لکھے گئے لیکن دیوان غالب مطبوعہ ۱۸۴۵ع میں موجود ہیں یا دوسرے ذرائع سے اس دور میں شمار کیے جا سکتے ہیں ۔

(د) گلبن ہندی... اس بیس (۲۰) سال کے عرصے میں مرزا کی توجہ زیادہ تر فارسی گوئی کی طرف تھی لیکن کبھی کبھار وہ اردو شعر بھی کہہ لیتے تھے ۔ ان اردو اشعار کو جو نسخۂ شیرانی کے متن یا حاشیے میں نہیں لیکن

دیوان غالب کے دوسرے مطبوعہ ایڈیشن (مئی ۱۸۴۷ع)
میں موجود ہیں، ہم نے گلبن ہندی کے تحت جمع کیا ہے۔
اس کے دو حصے ہیں -

(*i*) پہلے حصے میں وہ اشعار ہیں جو نسخۂ شیرانی
میں نہیں لیکن رام پور کے قلمی نسخے میں ہیں
جن کے شروع میں دیباچہ مورخہ ذی قعدہ
۱۲۴۸ھ درج ہے...

(*ii*) دوسرے حصے میں وہ اشعار ہیں جو رام پور
کے اس قدیمی نسخے میں نہیں لیکن دیوان
غالب کے دوسرے ایڈیشن میں موجود ہیں -

جو اشعار پہلے مطبوعہ ایڈیشن (۱۸۴۱ع) میں بھی موجود
تھے ان کی علیحدہ تصریح کر دی گئی ہے -

چوتھا دور ۱۸۴۷ع---۱۸۵۷ع

اس دور میں وہ اشعار ہیں جو اردو دیوان کے دوسرے
مطبوعہ نسخے ۱۸۴۷ع میں درج نہیں، لیکن اس قلمی نسخے
میں موجود ہیں جو مرزا نے ۱۸۵۷ع میں رام پور بھیجا...

پانچواں دور ۱۸۵۷ع---۱۸۶۹ع

اس دور میں وہ اردو اور منتخب فارسی اشعار ہیں جو
غدر کے بعد لکھے گئے اور جن کی تاریخ تصنیف شاعر کے خطوط
یا دوسرے ذرائع سے معین کی جا سکتی ہے"[۵]

ارمغان غالب کا ایک اور حاشیہ بھی قابل ملاحظہ ہے :
"نسخہ شیرانی کے آخیر کے چند صفحات غائب ہیں اور قرین
قیاس ہے کہ ان میں قطعات اور رباعیات ہوں۔ ان صفحات کی
کمی کی وجہ سے یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ... کون

سنِ رباعیات نسخۂ شیرانی کی کتابت کے وقت لکھی جا چکی تھیں"۶۔

اکرام صاحب آثار غالب (غالب نامہ طبع چہارم جزو اول) کے بہرۂ غالب نما اور اس کے بعد کی طباعت حکیم فرزانہ (طبع پنجم، غالب نامہ جز ؟ ؟ —۱۹۵۷ع) میں فرماتے ہیں :

"ارمغان غالب میں کلام غالب کو تاریخی تدوین سے پیش کرتے وقت ہم نے مرزا کے ان پانچ دوروں پر نظر رکھی ہے۔ چند مشکلات کی بناء پر... ہم مرزا کی شاعری کے پہلے دور کو آگرے کے اختتام قیام پر ختم نہیں کرسکتے، بلکہ نسخۂ بھوپال کی بناء پر یہ دور چوبیس سال کی عمر پر ختم کیا ہے۔ لیکن باقی دور وہی ہیں جو مرزا کی شخصی زندگی میں حد فاصل کی حیثیت رکھتے ہیں :

پہلا دور	=	۱۷۹۷ع ——— ۱۸۲۱ع
دوسرا دور	=	۱۸۲۱ع ——— ۱۸۲۷ع
تیسرا دور	=	۱۸۲۷ع ——— ۱۸۴۷ع
چوتھا دور	=	۱۸۴۷ع ——— ۱۸۵۷ع
پانچواں دور	=	۱۸۵۷ع ——— ۱۸۶۹ع

یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا کہ مرزا نے بیدل کی پیروی کس زمانے میں ترک کی، لیکن چونکہ نسخۂ حمیدیہ میں صاف اور اعلےٰ درجے کے اشعار کی تعداد بہت کافی ہے اس لیے قرین قیاس ہے کہ ۲۰—۲۲ سال کی عمر تک، یعنی دہلی آنے کے پانچ چھ سال بعد، وہ ابتدائی طرز بالکل ترک کرچکے ہوں گے... بھوپالی نسخہ میں، جو ۱۸۲۱ع میں نقل ہوا، کئی صاف اور

بلند پایہ اشعار ایسے ہیں جن میرزا بیدل کا رنگ بہت پھیکا پڑ گیا ہے اور جو دور ثانی کے بہترین اشعار کے ہم پایہ اور طرز تحریر کے اعتبار سے انہی کے مشابہ ہیں۔ مضمون اور زبان کی خصوصیات کے لحاظ سے تو یہ اشعار دوسرے دور کو ۱۸۲۱ع کی بجائے ۱۸۱۷ع سے شروع کر سکتے ہیں، چونکہ عبوری دور کے اشعار کی تدوین کا قیاس آرائی کے سوا دوسرا کوئی ذریعہ نہیں، اس لیے ہم نے خارجی شہادت کی بناء پر ان اشعار کو نسخۂ بھوپال کی باقی غزلوں کے ساتھ درج کیا ہے...دوسرے دور میں ہم نے وہ اشعار درج کیے ہیں جو نسخۂ بھوپال کی تاریخ کتابت کے بعد لکھے گئے لیکن نسخہ شیرانی میں موجود ہیں۔

مرزا کا دوسرا دور شاعری ہم نے ۱۸۲۷ع پر ختم کیا ہے۔ اس کے بعد ہمارا خیال ہے کہ ان کی توجہ اردو کی بہ نسبت فارسی کی طرف زیادہ ہو گئی اور ۱۸۲۷ع سے ۱۸۴۸ع تک انہوں نے زیادہ تر فارسی زبان میں شعر کہے ہیں، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ انہوں نے اردو شعرگوئی یک قلم ترک کر دی تھی۔ قیام کلکتہ کے دوران میں جب وہ فارسی غزلیں، قصیدے اور مثنویاں لکھ رہے تھے اس زمانے میں بھی انہوں نے اردو شعر کہے ہیں (مثلاً چکنی ڈلی کی تعریف میں) اس کے علاوہ جب انہوں نے (۱۲۴۸ ہجری میں ؟) منتخب اردو دیوان اشاعت کے لیے مرتب کیا تو پرانی غزلوں کے تتمے لکھے اور بعض دوسرے اشعار کا اضافہ بھی کیا۔ اس کے بعد چند ایک اہم اردو مشاعروں کے لیے اردو غزلیں لکھیں۔ ان اشعار کی تعداد اس قدر تھوڑی ہے کہ ۱۸۲۷ع سے ۱۸۴۷ع تک کے بیس سال مرزا کے فارسی کلام کا دور سمجھے جا سکتے ہیں"۔[۷]

آثار غالب میں ایک دوسری جگہ اکرام صاحب لکھتے ہیں :

''مرزا (غالب) نے سفر کلکتہ (بسلسلۂ پنشن) کے دوران میں فارسی اشعار اردو اشعار سے کہیں زیادہ لکھے ہیں ۔ اس سے اور مرزا کی بعض تحریروں سے خیال ہوتا ہے کہ وہ اس زمانے میں اردو شعر کم کہتے تھے لیکن لکھنؤ میں فارسی کے قدردان تھوڑے تھے اس لیے خیال ہوتا ہے کہ اس جگہ انہوں نے اردو اشعار زیادہ لکھے ہوں گے ۔ یہ غزل تو یقیناً قیام لکھنو کی یادگار ہے :

واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو
صد رہ آہنگ زمین بوس قدم ہے ہم کو

پہلے اس کے آخیر میں ذیل کے قطعہ بند اشعار تھے :

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا غالب
ہوس سیر و تماشا ، سو وہ کم ہے ہم کو
طاقت رنج سفر ہی نہیں پاتے اتنا
ہجر یاران وطن کا بھی الم ہے ہم کو
لائی ہے معتمدالدولہ بہادر کی امید
جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو

جب معتمد الدولہ کی طرف سے مرزا کو مایوسی ہوئی تو انہوں نے اشعار مندرجہ بالا کو بدل کر ذیل کا قطعہ درج دیوان کیا :

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا غالب
ہوس سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو

مقطع سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزم سیر نجف و طوف حرم ہے ہم کو

لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب
جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو

مرزا ۲۷ - جون ۱۸۲۷ع کو بروز جمعہ لکھنؤ سے روانہ ہوئے اور تین روز میں کان پور پہنچے - وہاں سے باندہ گئے، جہاں مولوی محمد علی صدر امین نے مرزا سے سابقہ تعارف نہ ہونے کے باوجود ان سے بڑا نیک سلوک کیا - قیام باندہ میں انہیں آرام سے رکھا اور کلکتہ کے بارسوخ آدمیوں کے نام تعارفی خطوط دیے - مرزا کا قیام باندہ اس لیے بھی دلچسپ ہے کہ انہوں نے یہاں سے چند غزلیں اپنے کسی دوست کو بھیجیں جو قلمی نسخۂ دیوان غالب (مملوکہ حافظ محمود خاں صاحب شیرانی) کے حاشیے پر درج ہیں - ایک غزل کا مطلع ہے :

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاق نسیاں کا

ایک اور غزل میں اپنا درد دل بیان کیا ہے :

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشت خس کہ گلخن میں نہیں

قلمی نسخے کے حاشیے پر اور بھی کئی غزلیں ہیں جن کے متعلق دیوان میں تو کوئی تصریح نہیں کہ وہ کب لکھی گئیں لیکن جو سفر کلکتہ کا کلام معلوم ہوتی ہیں - ایک غزل کا مقطع ہے :

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہریٔ یاران وطن یاد نہیں

ذیل کی درد ناک قطعہ بند غزل بھی اس قلمی نسخے کے حاشیے پر درج ہے :

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے"[۸]

اکرم صاحب کے بعد اس نسخے (نسخۂ شیرانی) کے بارے میں وہ نوٹ ہے جو حافظ محمود خاں شیرانی صاحب نے تیار کرایا تھا ۔ اس کی ٹائپ شدہ نقل یونیورسٹی لائبریری کے ریکارڈ میں ہے[۹] ذخیرۂ شیرانی حافظ صاحب سے ریٹائرڈ ہونے پر لیا گیا تھا ۔ نوٹ کتابوں کی ترسیل کے وقت تیار کیا گیا ہو گا ۔ متعلقہ اندراج یہ ہے :

No. 1882. Diwan-i-Ghalib.

This copy was persumably made before the poet undertook his journey to Calcutta, as some of the ghazals that he wrote during his itinerary are entered by the owner in the margin of this copy saying...... [Page No. 25.]

قاضی عبدالودود صاحب ۱۹۵۷ء میں لاہور آئے تھے انہوں نے نسخہ شیرانی کو دیکھا اور اس کا فوٹو سٹیٹ بنوا کر ہمراہ لے گئے ۔ اس فوٹو سٹیٹ کی مدد سے انہوں نے ایک مقالہ بعنوان "دیوان غالب کے دو نسخے" لکھا جو معاصر (پٹنہ) کے شمارہ ۱۲ (سنۂ اشاعت ندارد) میں شایع ہوا ۔ اس مقالے کے بعض حصے ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں :

"اس مقالے میں دیوان غالب کے نسخۂ حمیدیہ اور نسخۂ شیرانی سے بحث کی گئی ہے ، مگر یہ ناتمام ہے ۔ اس کا تکملہ آئندہ لکھا جائے گا ۔ اس میں حسب ذیل مخففات مستعمل ہوئے ہیں :

(ب) بھوپالی نسخہ جس کی کتابت بتاریخ ۵ صفر ۱۲۳۷ھ مکمل ہوئی -

دو چار سال قبل [غالباً اواخر ۱۹۵۷ع یا اوائل ۱۹۵۸ع سے دو چار سال قبل—وحید] میں [قاضی عبدالودود] بمبئی میں تھا تو میں نے کوشش کی تھی کہ کچھ دنوں کے لیے یہ نسخہ کتب خانۂ دانش گاہ بمبئی میں آ جائے لیکن یہ خبر ملی کہ بھوپال کے جس کتب خانے میں تھا [جس کتب خانے سے مراد حمیدیہ لائبریری ہے - وحید] وہاں نہیں ہے - بعد کو ڈاکٹر گیان چند نے بھی اس کی تصدیق کی -

(ح) نسخۂ حمیدیہ -

(حب) حاشیۂ ب [حاشیۂ نسخۂ بھوپال]

(حش) حاشیۂ ش [حاشیۂ نسخۂ شیرانی]

(ش) نسخۂ شیرانی

جو اب کتبِ خانۂ دانشگاہ پنجاب میں ہے -

(ن) دیوان مروجہ ' اس وقت میرے پیش نظر جناب مالک رام کا مرتبہ نسخہ ہے......غالب رجب ۱۲۳۷ھ میں ۲۵ برس کے ہوئے تھے اور ان کا ایک دیوان جس کی کتابت اسی سال میں ہوئی تھی [مراد نسخۂ بھوپال] چند سال قبل تک موجود تھا - اس سے قدیم تر نسخہ زمانۂ حال کے کسی شخص کے علم میں نہیں......

مروجہ دیوان اور ''ب'' و ''ش'' کے مقابلے سے واضح ہوتا ہے کہ ان میں سیکڑوں اشعار مشترک ہیں...

غالب نے پرانے دیوان کا انتخاب کیا اس کے بارے میں فی‌الحال اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کا زمانہ '

گلشن بے خار میں ان کا ترجمہ قلم بند ہونے (غالباً ۱۲۴۸ھ) سے قبل ہے...دیوان اردو پہلی بار ۱۲۵۷ھ [اکتوبر ۱۸۴۱ع] میں طبع ہوا اور ۱۰۹۵ اشعار پر مشتمل تھا۔ ظاہر ہے اس میں انتخاب کے بعد کے اشعار بھی شامل ہوں گے۔

طبع ثانی کا زمانہ اس کے چند سال بعد ہے[...مئی ۱۸۴۷ع وحید] اور ان کے اشعار کی تعداد ۱۱۱۱ ہے۔

غالب کے دوران حیات میں دیوان چار بار اور چھپا (حاشیۂ ودود: اس میں نگارستان سخن شامل نہیں)۔ ان چاروں میں کانپوری نسخہ سب سے زیادہ صحیح المتن ہے۔ غالب کی وفات کے بعد برسوں تک اس کی نقل یا نقل در نقل چھپا کی، مگر ان میں اور کانپوری نسخے میں یہ فرق ہے کہ سہرا موخرالذکر سے غیر حاضر ہے۔ کانپوری نسخے کے اشعار کی تعداد ۱۸۰۲ ہے۔"

اس کے بعد قاضی صاحب نے نسخۂ حمیدیہ کی بعض کوتاهیوں کی وضاحت کی ہے اور خاص طور پر مندرجہ ذیل امور پر بحث کی ہے:

(۱) مرتب نسخۂ حمیدیہ نے قسم اول، دوم سوم کی تقسیم کے علاوہ یہ پابندی بھی ہے کہ ب و ن کے مشترک اشعار، جو قسم اول میں شامل ہیں ان میں "م" کے ساتھ انہیں مرقوم کیا ہے، لیکن "م" کبھی درج کرتے ہیں، کبھی نہیں کرتے۔

(۲) آخر میں ایسے اشعار جو "ن" میں ہیں مگر "ب" سے غیرحاضر ہیں زیر عنوان "مطبوعہ" درج کیے ہیں، لیکن مطبوعہ کے تحت بعض اوقات ایسے اشعار بھی جو "ب" میں باختلاف موجود ہیں، درج کر دیے گئے ہیں۔

(۳) مرتب نسخۂ حمیدیہ نے اپنی تمہید میں اشعار کی شق وار تعداد کا جو نقشہ دیا ہے اس میں بھی بہت سی غلطیاں ہیں [قاضی صاحب نے اپنے پیش کردہ نقشے میں اس کی وضاحت کر دی ہے] -

(۴) مرتب نے قسم اول، دوم، سوم کی پابندی بھی ہر جگہ سختی سے نہیں کی [سات مثالیں موجود ہیں] -

(۵) قسم اول کا ایک شعر جو "ب" و "ن" میں مشترک ہیں "ح" میں نقل نہیں ہوا -

(۶) مرتب نے تمہید میں یہ نہیں لکھا کہ حواشی "ب" میں مکمل غزلیں اور متفرق اشعار کس قدر ہیں - کسی خاص غزل یا کسی خاص شعر کے متعلق یہ اطلاع کہ حاشیہ "ب" میں ہے حواشی "ح" سے ملتی ہے [قاضی صاحب کے شمار کے مطابق ایسی کل غزلیں ۶ اشعار ۶۱ ، مشترک اشعار ۵۱ ہیں - ان غزلوں کے علاوہ قاضی صاحب نے قسم اول، کی غزلوں کے حاشیے پر درج شدہ متفرق اشعار اور قسم دوم کی غزلوں کے اشعار کی نشان دہی بھی کی ہے اور تعداد بھی شمار کی ہے] -

مرتب (نسخۂ حمیدیہ کے مرتب قاضی انوارالحق) کا قول ہے :

مروجہ دیوان میں جتنی کٹی پھٹی غزلیں وہ سب اس (ب) میں مکمل موجود ہیں- جو اشعار متفرق طور پر تلاش کر کے بعض دیوانوں میں بڑھائے گئے تھے اور جن کی بابت قیاسی طور پر کہا جاتا تھا کہ غالب کے ہیں وہ بھی سب کے سب اس میں پائے جاتے ہیں -

——(تمہید..۸)

بہت سی کٹی چھٹی غزلیں بے شبہہ "ب" میں مکمل موجود ہیں لیکن "ب" میں ایسی متعدد غزلوں کا ایک شعر بھی نہیں مثلاً :

"شرم"

اور

"کیا کریں"

ردیف کے اشعار ۔

اور شواھد درکنار خود حواشی "ح" سے ثابت ہے کہ "متفرق" اشعار میں بھی بعض مثلاً :

شکوۂ.....دیوانہ تھا ۔

"ب" یا اس کے حواشی میں نہیں ۔

میرا خیال ہے کہ "ب" (حوض و حاشیہ) میں ۵ صفر ۳۷ھ [= ۱۲۳۷ھ] کے قبل کا بھی کل کلام نہیں ، مثلاً وہ غزل جس کا مقطع غالب کے خط میں ہے [کون سے خط میں اور کون سا مقطع، اس کی صراحت قاضی صاحب نے نہیں کی۔ تفصیل کے لیے اسی اقتباس کے آخر میں درج شدہ راقم السطور کا فٹ نوٹ ملاحظہ ہو——وحید] اور جو یقین ہے کہ تاریخ مذکور سے پیشتر کی ہے ۔ اس کے بعد کے [یعنی ۵ صفر ۱۲۳۷ھ کے بعد کے——وحید] کل کلام کے تو اس میں ہونے کا سوال ہی نہیں ۔

[نسخہ حمیدیہ کے مرتب کا ارشاد ہے] یہ دیوان کم سے کم ایک بار اور ممکن ہے کہ چند مرتبہ تصحیح و ترمیم کی غرض سے غالب کے پاس بھی گیا ہے اور ان کی نظر سے گزرا ہے ۔ اور انہوں نے خود اس میں جا بجا اصلاحیں کی ہیں کیونکہ

اگرچہ اصلاحوں کا خط بہت خراب اور شکستہ ہے لیکن پھر بھی اس میں اور غالب کے طرز تحریر کے موجودہ نمونوں میں ایک گونہ مشابہت پائی جاتی ہے اور گو محض اس کی بناء پر ان کو غالب کا قلمی قرار دینا شاید درست نہ ہو، لیکن خود ان اصلاحوں کی نوعیت ایسی ہے کہ ان کو مصنف کے سوا اور کسی کے قلم کی طرف منسوب کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ ان میں اکثر ایسی ہیں کہ لفظ کو کاٹ کر اس کی جگہ دوسرا لفظ رکھ دیا ہے یا کسی مصرع کی کچھ صورت بدل دی ہے۔ بہت سی غزلیں بھی اس قسم سے حاشیے پر بڑھائی گئی تھیں۔

———(تمہید)

حواشی میں جو اشعار ہیں وہ بے شبہہ غالب کے ہیں اور اور اصلاحوں کے ذمہ دار بھی وہی ہیں لیکن کاتب کون ہے اس کے متعلق فیصلہ کن بات "ب" کو دیکھے بغیر نہیں کہی جا سکتی[۱۰]۔"

اضافات و اصلاحات کے متعلق مرتب [قاضی انوارالحق] کے ایسے اقوال سے جو نقل نہیں ہوئے، قاضی صاحب کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کے سب ۵ صفر ۳۷ھ (۱۲۳۷ھ) کے بعد کے ہیں مگر اس کا بھی امکان ہے کہ کچھ اس سے قبل کے ہوں[۱۱]۔

قاضی عبدالودود صاحب کے اسی مقالے کے دوسرے حصے میں نسخۂ شیرانی کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے یہ حصہ صفحہ ۱۳ سے ۴۷ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں قاضی صاحب نے نسخۂ شیرانی کے بارے میں چھ بنیادی نکات پیش کیے ہیں۔ اول قلمی نسخے کی کیفیت، دوم نسخہ شیرانی کے وہ ۲۵ اشعار جو اس کے حوض اور حاشیے میں ہیں اور "ل" یا "ن" سے غیر حاضر ہیں، سوم "س" و "ح"

کے متون کا باہمی مقابلہ ' چہارمؔ ان آٹھ غزلوں کی نشان دہی جو ''حش'' اور ''ن'' میں ہیں مگر ''ب'' میں نہیں ہیں' پنجم نسخۂ شیرانی کے کاتب کے طریق املا کی وضاحت' ششم نسخۂ شیرانی کا زمانۂ کتابت - ان میں سے نقطۂ اول ' دوم اور ششم کی تفصیل ذیل میں پیش کی جاتی ہے :

(I) ''نسخۂ شیرانی (۱۲) لاہور میں میری نظر سے گزرا تھا لیکن اس مقالے کی تحریر کے وقت اس کا عکس سامنے ہے - یہ موجودہ حالت میں ۱۰۹ اوراق پر مشتمل ہے- ورق اول کے صفحہ ۱ میں صرف ''دیوان غالب اردو'' مرقوم ہے ' دوسرے صفحے سے دیوان شروع ہوتا ہے اور اس میں ۴ شعر ہیں مسطر ۱۱ سطروں کا ہے - مگر بہت کم صفحے ایسے ہیں جن میں ۱۱ اشعار ہوں -

ورق ۲۶ اس مقطع پر تمام ہوتا ہے جس کا مصرع ۲ یہ ہے :

عالم همه افسانۂ ما دارد و ما هیچ (ح صفحہ ۶۴) اور اشارۂ کاتب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد کی غزل لفظ ''نفس'' سے شروع ہوتی ہے ' لیکن ورق ۲۷ کا آغاز : نوازش ...استخوان فریاد (ح صفحہ ۶۹) سے ہوتا ہے جو ''فریاد'' ردیف والی غزل کا مطلع نہیں -

ح صفحہ ۶۳ سے پتا چلتا ہے کہ ''نفس'' کی ایک غزل :

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ

کا پہلا لفظ ہے -

ورق ۲۶ کے بعد کم از کم ایک ورق غائب ہے -

ورق ۱۰۶ -

دل و دین نقد...دست گرداں ہے

پر تمام ہوتا ہے اور اشارۂ کاتب اس پر مشعر ہے کہ صفحۂ آئندہ ”غم آغوش“ سے شروع ہوتا ہے جو اسی زمین کا ایک شعر ہے اور ”ن“ میں موجود ہے -

ورق ۱۰۷ کا آغاز غزل کے کسی شعر سے نہیں بلکہ قصیدۂ نونیہ کے اس شعر سے ہوتا ہے جو ”ب“ میں اس قصیدے کا چوتھا شعر ہے -

ورق ۱۰۶ کے بعد کتنے اوراق ضائع ہو گئے ، اس بارے میں قطعی طور پر کچھ کہنا ممکن نہیں - قصیدے کا خاتمہ ورق ۱۰۹ کے دوسرے صفحے پر ہوتا ہے - آخری مصرع یہ ہے : وقف احباب گل ولالۂ فردوس بران

(I) ”ش“ (حوض و حاشیہ) کے حسب ذیل ۲۵ اشعار ”ب“ یا ”ن“ سے غیر حاضر ہیں (ابتدا میں غزل کا شمار دیا گیا ہے) :

۳ عالم طلسم شہر خموشاں ہے سر بسر
یا میں غریب کشور گفت و شنود تھا

۷۰ سمجھا ہوا ہوں عشق میں نقصاں کو فائدہ
جتنا کہ نا امید تر امیدوار تر

(حاشیہ) پیٹھ محراب کی قبلے کی طرف رہتی ہے
محو نسبت ہیں تکلف ہمیں منظور نہیں

۱۱۳ میکشی کو نہ سمجھ بے حاصل
بادہ غالب عرق بید نہیں

(حاشیہ) ابر روتا ہے کہ بزم طرب آمادہ کرو
برق ہنستی ہے کہ فرصت کوئی دم ہے ہم کو

طاقت رنج سفر بھی نہیں پاتے اتنی
ھجر یاران وطن کا بھی الم ہے ہم کو

لانی ہے معتمدالدولہ[۱۳] بہادر کی امید
جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو

(حاشیہ) ہو کر شہید عشق میں پائے ہزار جسم (زخم ؟)
ہر موج گرد راہ مرے سر کو دوش ہے

۱۵۴ وہ بات چاہتے ہو کہ جو بات چاہیے
صاحب کے ہمنشین کو کرامات چاہیے

دے داد اے فلک دل حسرت پرست کی
ہاں کچھ نہ کچھ تلافیٔ مافات چاہیے

۱۷۷ زندگی میں بھی رہا ذوق فنا کا مارا
نشہ بخشا غضب اس ساغر خالی نے مجھے

بس کہ بے فصل خزاں چمنستان سخن
رنگ شہرت نہ دیا تازہ خیالی نے مجھے

جلوہ خور سے فنا ہوتی ہے شبنم غالب
کھو دیا سطوت اسمائے جلالی نے مجھے

۲۱۲ اے بیخبران میرے لب زخم جگر پر
بخیہ جسے کہتے ہو شکایت ہے رفو کی

گو زندگی زاھد بے چارہ عبث ہے
اتنا ہے کہ رہتی تو ہے تدبیر وضو کی

۲۱۴ دل تو ہو اچھا نہیں ہے گر دماغ
کچھ تو اسباب تمنا چاہیے

۲۲۰ یہ کون کہوے ہے آباد کر ہمیں لیکن
کبھی زمانہ مراد، دل خراب تو دے

۲۲۱ طلسم منت یک خلق سے رہائی دی
جہاں جہاں مرے قاتل کا مجھ پہ احسان ہے
جنہوں نے مجھ کو بنایا ہے مدعی میرا
ہمیشہ ہاتھ میں میرے مرا گریباں ہے
اسد کو زیست تھی مشکل اگر نہ سن لیتا
کہ قتل عاشق دلدادہ تجھ کو آساں ہے

۲۲۵ انجام شمار غم نہ کچھ پوچھ
یہ مصرف تا بکے نہیں ہے
جس دل میں کہ تا بکے سما جائے
واں عزت تخت کے نہیں ہے

۲۳۸ پوچھے ہے کیا معاش جگر تفتگان عشق
جوں شمع آپ اپنی وہ خوراک ہو گئے

۲۴۳ کمال حسن اگر موقوف انداز تغافل ہو
تکلف برطرف تجھ سے تری تصویر بہتر ہے

۲۴۴ خوانا نہیں ہے خط رقم اضطراری
تدبیر پیچتاب نفس کیا کرے کوئی...

(VI) "ش" کا زمانۂ کتابت اس کتاب میں درج نہیں، لیکن قیاس چاہتا ہے کہ اس میں کوئی چیز ماۃ سیزدھم کے عشرۂ چہارم کے نصف اول سے قبل کی لکھی ہوئی اور ۱۲۴۵ھ کے بعد کی نہ ہو" ۱۴

۱۹۵۸ع میں مولانا امتیاز علی عرشی نے غالب کے جملہ اردو

کلام کو دیوان غالب کے نام سے شائع کیا[۱۵] نسخۂ شیرانی کا جو فوٹوسٹیٹ جناب قاضی عبدالودود اسی سال کے آغاز یا ۱۹۵۷ء کے اواخر میں لاہور سے لے گئے تھے اسے قاضی صاحب سے لے کر اس طباعت میں استعمال کیا گیا[۱۶] عرشی صاحب دیباچے میں مختلف قلمی نسخوں پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

تدوین اشعار: مرزا صاحب نے ایک خط میں لکھا ہے کہ میرا کلام، کیا نظم، کیا نثر، کیا اردو، کیا فارسی، کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم نہیں ہوا ۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ابتدا میں خود انہیں نے اپنا کلام جمع کیا تھا اور انہیں کے مسودات سے "دیوان ریختہ" مرتب ہوا اور انہیں سے 'گل رعنا' کی ترتیب عمل میں آئی ۔

اردو کلام کو بترتیب ردیف جمع کرنے کا کام ماہ صفر سنہ ۱۲۳۷ھ (آخر اکتوبر سنہ ۱۸۲۱ع) سے قبل انجام کو پہنچ چکا تھا، جو نسخہ بھوپال کی تاریخ کتابت ہے ۔ آیندہ اسی نسخے میں کمی بیشی ہو کر موجودہ دیوان وجود میں آیا ہے ۔

فارسی نظم کا کچھ حصہ 'گل رعنا' کی شکل میں کلکتے کے سفر میں مرتب ہو چکا تھا ۔ مگر مکمل دیوان فارسی، دیباچۂ دیوان اردو کے بیان کے مطابق اس سفر تک غیر مرتب مسودے کی شکل میں تھا ۔

پنج آهنگ کے دیباچے میں علی بخش خاں لکھتے ہیں :

"در آغاز سال یک هزار و دو صد و پنجاه و یک هجری شمس الدین خان را بقضای آسمانی آن پیش آمد که هیچ آفریده مبیناد ! و آن خود از غایت شهرت بشرح احتیاج ندارد و بعد آن هنگامه هم در آن هنگام از جے پور بدهلی رسیدم، و بکاشانهٔ

برادر والا شان و آموزگار مہربان، مولانا غالب" زاد افضالہ، فرود آمدم ۔ چون در آن ایام دیوان فیض عنوان کہ مسمی بہ "مے خانۂ آرزو سر انجام" است تازہ فراہم آمدہ و بپرایۂ اتمام پوشیدہ بود"

اس عبارت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۲۵۱ھ (۱۸۳۵ع) کے لگ بھگ دیوان فارسی مرتب ہوا تھا ۔ لیکن بانکی پور کے قلمی نسخے میں جس کی تاریخ کتابت ربیع الآخر ۱۲۵۴ ہے، خود مرزا صاحب نے ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۷ع) کو سال اختتام بتایا ہے اس لیے اتمام کلیات کا سال یہی قرار پائے گا ۔

بہر حال اردو اور فارسی کلام کی جمع و ترتیب کا ابتدائی کام مرزا صاحب ہی کے ہاتھوں انجام کو پہنچا ، اور انہیں اپنے کلام کی اشاعت کے لیے دوسروں سے مسودے یا مبیضے مانگنا نہیں پڑے ، لیکن جب افکار و آلام کی کشمکش اور ناقدردانی ابنای زمان کی گیرودار نے انہیں پیہم شکستہ خاطر کیا تو یہ کام نواب ضیاء الدین احمد خان بہادر اور حسین مرزا صاحب وغیرہ نے اپنے ذمے لے لیا تھا ۔

دیوان اردو نسخہ بھوپال : جیسا کہ ابھی مذکور ہوا ، مرزا صاحب نے اپنا ردیف‌وار اردو دیوان صفر ۱۲۳۷ھ (۱۸۲۱ع) میں صاف کرایا تھا ۔ اس کی اصل کوئی مردف دیوان تھا ، یا وہ بیاض تھی جس میں بترتیب نظم اشعار لکھے گئے تھے۔ اس سوال کا جواب دینے کے لیے ابھی تک کوئی مسالا نہیں مل سکا ، لیکن یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ مرزا صاحب نے ۱۲۳۷ھ سے قبل کے کہے ہوئے متعدد شعر اس میں شامل نہیں کیے تھے ۔ چنانچہ "یاد گار نالہ" کے وہ شعر جو عمدۂ منتخبہ، عیار الشعرا اور دوسرے قدیم ماخذوں سے نقل کیے گئے ہیں اس دعوے کا بین ثبوت ہیں ۔

انتخاب دیوان اردو، نسخۂ شیرانی: لیکن اس دیوان کے اشعار کا بڑا حصہ پیچیدہ خیالی مضامین اور مغلق تشبیہہ و استعارہ پر مشتمل تھا "جاہل اسے سن کر ملول ہوتے" اور اکثر اشعار کو مہمل اور بے معنی کہہ دیا کرتے تھے۔ سخنوران کامل کی طرف سے بھی آسان کہنے کی فرمائش ہوتی تھی۔ مرزا صاحب کو ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا نہ تھی، اس لیے وہ عرصے تک ان اعتراضوں سے بے پروا رہے۔ لیکن جوں جوں فارسی کے اعلیٰ شاعروں کا کلام نظر سے گزرتا گیا اور ان کی ادبی استعداد میں جلا ہوتی گئی انہیں بھی اپنے کلام کے لفظی و معنوی عیوب نظر آنے لگے، اور وہ کلام ریختہ کی تہذیب و تنقیح کی طرف متوجہ ہو گئے۔ چنانچہ بہت سی غزلیں "غلط" قرار دیں، فقرے، مصرعے اور شعر بھی بدلے اور آسان و دل نشیں انداز کی غزلیں بھی کہیں۔

تہذیب و تنقیح کا یہ کام صفر ۱۲۳۷ھ (اکتوبر ۱۸۲۱ء) کے بعد شروع ہوا اور سفر کلکتہ سے پہلے شوال ۱۲۴۲ھ (اپریل ۱۸۲۶ء) میں ختم ہو گیا اس قیاس کی وجہ یہ ہے کہ نسخۂ بھوپال کے حاشیوں اور بین السطور میں ترمیمیں اور اصلاحیں بھی ہیں اور نئے شعر اور غزلیں بھی۔ نیز ردیف الیاء کی متعدد غزلیں آخر میں بھی تحریر کر دی گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اصلاح و اضافے کا یہ کام اس کی تاریخ کتابت کے بعد ہی شروع کیا جا سکتا تھا، ورنہ وہ سب کچھ بجائے حاشیوں کے متن میں مندرج ہوتا۔ نیز مولانا محمود خاں شیرانی مرحوم کے پاس دیوان کا وہ مخطوطہ دستیاب ہو چکا ہے جو بھوپالی نسخے کا مبیضہ تھا۔ اس کے متن کے مندرجات بالکل بھوپالی نسخے کی ترمیموں کے مطابق ہیں، لیکن حاشیوں پر بعد کی کہی ہوئی غزلیں بھی درج ہیں۔ ان میں سے دو مرزا صاحب نے "باندہ" (بوندیل کھنڈ) سے

بھیجی تھیں، جو سفر کلکتہ کی ایک منزل تھی۔ ظاہر ہے کہ نسخۂ شیرانی سفر کلکتہ سے پہلے ہی مرتب نہ ہو گیا ہوتا تو اس کے حاشیوں پر سفر کے دوران میں کہی گئی غزلیں کس طرح مندرج ہو سکتی تھیں۔

دوسرا انتخاب گل رعنا : قیام کلکتہ میں مولوی سراج الدین احمد سے مرزا صاحب کی دوستی ہو گئی اور انہوں نے فرمائش کر کے اردو اور فارسی غزلوں کا ایک اور انتخاب مرتب کرایا جو ''گل رعنا'' کے نام سے موسوم ہوا۔ اس کے حصۂ فارسی میں تو صرف منتخب غزلیں درج کی گئی تھیں، لیکن ریختہ میں سے دو چار مکمل غزلیں لے کر باقی میں سے اچھے اچھے شعر چن لیے تھے۔ اس کا ایک ناقص نسخہ مولانا حسرت موہانی مرحوم کو ملا تھا، جس میں کچھ غیر مشہور شعر انہوں نے اپنی شرح کے آخر میں چھاپ بھی دیے تھے۔ لیکن سوء اتفاق سے وہ بھی اہل ذوق کی دسترس سے باہر ہو گیا تھا۔ خوش قسمتی کہ اب سے تقریباً دو سال قبل محبی مالک رام صاحب کو ان کے ایک دوست نے اس کا مکمل نسخہ تحفے میں دیا، جس سے معلوم ہوا کہ منتخب اشعار کی تعداد ۴۵۴ ہے اور ان میں نسخہ شیرانی کی اکثر بے مزہ غزلوں کا کوئی ایک شعر بھی موجود نہیں ہے۔ گل رعنا کے اس مخطوطے میں سال انتخاب ناقص رہ گیا ہے۔ تاہم یہ یقینی ہے کہ وہ قیام کلکتہ کا کارنامہ ہے جو ۴ شعبان ۱۲۴۳ھ (۱۹ فروری ۱۸۲۸ع) سے شروع ہو کر ربیع الاول ۱۲۴۵ھ (ستمبر ۱۸۲۹ع) میں ختم ہوا تھا۔

تیسرا انتخاب : نسخہ اول دیوان: کلکتے سے واپس آنے کے بعد مرزا صاحب نے اپنے انتخاب اول پر نظرثانی کر کے ایک اور

مختصر سا دیوان مرتب کر لیا ۔ اس سلسلے میں نواب شمس الامرا کو لکھتے ہیں :

''تا بپارسی زبان ذوق سخن یافت، ازان وادی عنان اندیشہ بر تافت ۔ دیوان مختصرے از ریختہ فراہم آورد و آن را گلدستۂ طاق نسیان کرد''۔

مولوی عبدالرزاق شاکر کو ایک اردو خط میں تحریر کیا ہے :

''آخر جب تمیز آئی ، اس دیوان کو دور کیا ۔ اوراق یک قلم چاک کیے ؛ دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوان حال میں رہنے دیے''۔

اس دیوان حال کے قدیم ترین مخطوطۂ رام پور کے اشعار کا مقابلہ '' گل رعنا'' کے حصہ اردو سے کیا جائے ، تو معلوم ہوتا ہے کہ گل رعنا کے ۴۵۴ اردو اشعار میں سے صرف ۲۰ یا ۲۵ شعر گرائے گئے تھے اور سابق غزلوں کے مزید شعر چن کر اور نئی غزلوں کے کل شعر ایزاد کر کے غزلوں کے اشعار کو ۹۷۸ کر دیا گیا تھا'' ۔

آگے چل کر ان مختلف نسخوں کا تفصیلی جائزہ بھی لیا گیا ہے ۔ جن پر عرشی صاحب نے اپنے متن کی بنیاد رکھی ہے ۔ اس حصے میں سے ابتدائی تین قلمی نسخوں کی کیفیت یوں بیان ہوئی ہے :

۱ ۔ **نسخہ بھوپال** (اس کی علامت ق ہے)

'دیوان غالب کے نسخوں میں سب سے پرانا اور اہم مخطوطہ یہی ہے ۔ میں نے انجمن ترقی اردو (ہند) کے اجلاس ناگپور سے واپسی میں خاص اس نسخے کو دیکھنے کے لیے بھوپال میں دو دن قیام کیا تھا ۔ اس مختصر مدت میں اس گوہر

بے بہا کی حالت بھی دیکھی اور اصل سے مطبوعہ نقل کا مقابلہ بھی کیا ۔ حالت یہاں بیان کرتا ہوں ۔

(مقابلے کا نتیجہ اختلاف نسخ میں ملاحظے فرمائیے ۔)

اس مخطوطے کا ناپ $\frac{۲۹ \times ۲۲}{۸}$ اور کاغذ عمدہ کشمیری ہے ۔ جدولیں رنگین اور طلائی اور باریکا لاجوردی ہے روشنائی سیاہ اور عنوانات شنجرفی ہیں ۔

شروع میں فوجدار محمد خان بہادر کی مہر ہے جس میں سنہ ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ع) منقوش ہے ۔ ابتدائی سادہ اوراق میں سے پہلے دو ورقوں پر وہ فارسی غیر منقوط خط نقل کیا گیا ہے جو مرزا صاحب نے مولانا فضل حق خیرآبادی مرحوم کو لکھا تھا ۔ ان دونوں ورقوں کے بعد دو اور انگریزی کاغذ کے ورق ہیں جس میں سے پہلے کے رخ ب میں شمسے کے اندر لکھا ہے :

”دیوان ھذا من تصنیف مرزا نوشہ دھلوی المتخاص بہ اسد ۔ از کتب خانۂ سرکار فیض آثار عالی جاہ عالم پناہ میاں فوجدار محمد خان بہادر دام اقبالہ“ ۔

قلمی خوشخط ۔ دوسرے ورق کے رخ الف میں شمسے کے اندر فوجدار محمد خان کی بڑی مہر ہے جس میں بخط طغرا 'فوجدار محمد خان بہادر' منقوش ہے اس مہر کا سنہ ۱۲۶۱ھ ہے ۔ اصل دیوان کے ورق ۱ الف پر انہیں صاحب کی دو چھوٹی مہریں ثبت ہیں جن میں سنہ ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء) منقوش ہے یہ مہر کتاب کے اندر بھی کئی جگہ نظر آتی ہے ۔

دیوان کا آغاز رنگین اور طلائی لوح کے تحت ہوا ہے اور اور شروع میں قصاید درج ہیں ۔ سب سے پہلا قصیدہ فارسی کا ہے جس کا آغاز ہے : ”بہر ترویج جناب والی یوم الحساب“ یہ

قصیدہ ورق ۸ الف پر ختم ہو گیا ۔ اس کے بعد ۸ الف کی آخری سطر سے ''قصیدہ حیدری بہ تمہید بہار مغفرت'' شروع ہوا ہے جس کا آغاز ہے : ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بیکار ۔

اس کا انجام ورق ۹ ب کی سطر ۲ پر ہوا ہے اس کے بعد 'ایضاً فی المنقبت' کے عنوان سے دوسرا اردو قصیدہ ملتا ہے جس کا آغاز ہے : توڑے ہے عجز تنک حوصلہ بر روے زمین ۔ یہ قصیدہ ورق ۹ب کی سطر ۳ سے شروع ہو کر ورق ۱۲ ب پر ختم ہوا ہے ۔ اس کے بعد اسی عنوان سے تیسرا قصیدہ شروع ہوتا ہے جس کا آغاز ہے : جو نہ نقد داغ دل کی کرے شعلہ پاسبانی ۔ یہ ورق ۱۲ ب کی سطر ٦ سے شروع ہو کر ورق ۱۴ الف پر تمام ہوتا ہے ۔

ورق ۱۵ ب سے دوسری رنگین اور طلائی لوح کے تحت غزلیں شروع ہوتی ہیں اس پورے حصے میں دو غزلوں کے درمیان ایک سطر سادہ چھوڑی گئی ہے ۔ ان سادہ جگہوں میں معمولی خط میں جو بظاہر خود غالب کا ہے جگہ جگہ ''ولہ'' لکھا گیا ہے ۔

آخر میں کاتب نسخہ نے شنجرفی روشنائی سے لکھا ہے : ''دیوان من تصنیف مرزا صاحب و قبلہ المتخلص بہ اسد و غالب سلمہم ربہم علی یدالعبد المذنب حافظ معین‌الدین بتاریخ پنجم شہر صفرالمظفر سنہ ۱۲۳۷ من الھجرۃ النبویہ صورت اتمام یافت'' ۔

اس عبارت کے نیچے پھر فوجدار محمد خاں کی چھوٹی مہر ہے ۔

دیوان کے متن اور حواشی دونوں میں جگہ جگہ اصلاحیں

اور اضافے نظر آتے ہیں۔ ان کا قلم، روشنائی اور روشن خط تینوں مختلف ہیں، جس سے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ کام مختلف اوقات میں انجام دیا گیا ہے۔ دیوان کے آخری سادہ اوراق میں بھی بعد کی لکھی ہوئی غزلیں لکھی ہیں مگر یہ سب ردیف یا کی ہیں۔ حک و اضافے کا خط جگہ جگہ مرزا صاحب کے اس خط سے ملتا ہے جس سے ہم آشنا ہیں، لیکن بعض مقامات پر وہ بالیقین مرزا صاحب کا نہیں معلوم ہوتا، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انہوں نے سرخوشی یا کسی دوسری وجہ سے کسی اور سے بھی یہ کام لیا ہے۔

کچھ غزلوں کے آغاز کی سادہ جگہوں میں لفظ ''غلط'' لکھا گیا ہے اور بعض غزلوں پر حرف ''غ'' اس طرح لکھا ہے کہ اس کا سر مطلع کے دونوں مصرعوں کے بیچ میں آیا ہے اور دائرے نے ساری غزل کو گھیر لیا ہے۔ یہ سب غزلیں وہ ہیں جو نسخۂ شیرانی میں شامل نہیں کی گئی ہیں۔ چند غزلوں کے مقابل حاشیے پر ''مکرر نوشتہ شد'' لکھا ہوا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان عبدالعلی نام کے کسی صاحب ذوق کے مطالعے میں بھی رہ چکا ہے۔ انہوں نے کئی جگہ اپنی پسندیدگی اشعار کا اظہار حاشیوں پر صاد بنا کر کیا ہے اور اکثر جگہ اس صاد کے ساتھ اپنا نام بھی لکھ دیا ہے۔ ردیف ''غ'' کی پہلی غزل ''عشاق اشک چشم سے دھوئیں ہزار داغ'' کے متعدد شعروں کے مقابل 'پسند عبدالعلی۔ منہ' لکھا ہے۔

اسی ردیف کی دوسری غزل کے مقابل لکھا ہے: 'پسند خاطر عبدالعلی'، ورق ۲۸ ب کے اوپر کے حاشیے میں لکھا ہے: 'مقابلہ کردہ شد'

ورق ۲۹ الف کے حاشیے میں بریکٹ کے اندر لکھا ہے:

'محمد عبدالصمد مظہر'

میرے لیے یہ صاحب بھی انجان ہیں ۔

آخری سادہ اوراق میں جو غزلیں اضافہ کی گئی ہیں ان کے آخر میں لکھا ہے :

'دیکھ تو عکس قد یار لب جو پر سے ۔ تمام شد ۔ کار من نظام شد ۔ رب یسر و تمم بالخیر''۔

بد نما خط میں جو اضافے یا اصلاحین ہیں ان میں املا کی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں مثلاً فلک سے ہم کو عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضہ ہے'' میں تقاضا کو ''نقضا' لکھا ہے ۔ یا ''وارستگی' بہانۂ سنگیں دلی نہیں'' میں 'بہانئے' یا ''بوسے میں وہ مضائقہ نہ کرے'' میں 'مضاعقہ' یا ''ھر ایک ذرۂ عاشق ہے آفتاب پرست'' میں ''زرہ'' یا ''رنگ ہے سنگ محک' دعوای مینا عبث'' میں ''سنگ مہک'' ، یا ''خانہ زاد زلف ہیں، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں'' میں بھاگے نگے'' لکھ دیا ہے ۔

اس قسم کی غلطیاں غالب جیسے شخص سے ۲۵ سال کی عمر میں سخت حیرت انگیز ہیں[۱۷] ۔

مفتی صاحب کی رائے میں یہ نسخہ لکھا تو گیا تھا فوجدار محمد خان بہادر بھوپالی کے لیے' لیکن کم سے کم ایک بار اور ممکن ہے کہ چند مرتبہ تصحیح و ترمیم کے غرض سے غالب کے پاس بھی گیا اور ان کی نظر سے گزرا ۔ لیکن فی الحقیقت یہ مرزا صاحب ھی کے لیے لکھا گیا تھا اور نسخۂ شیرانی کی تیاری تک انہیں کے پاس رہا تھا ۔ اس کے بعد عبدالعلی صاحب اور عبدالصمد مظہر کے پاس ھوتا ہوا فوجدار محمد خان بہادر کے کتاب خانے میں پہنچا۔ بھوپال پہنچنے کا زمانہ کیا تھا ' اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن ۱۲۴۸ھ والی 'مہر بتاتی ہے

کہ بہر حال اس سال کے بعد ہی اسے وہاں باریابی حاصل ہوئی ہو گی جو دیوان غالب کے متداول انتخاب کی تاریخ ترتیب و تالیف ہے۔

۲ - نسخۂ شیرانی (اس کی علامت قا ہے)

تاریخی لحاظ سے یہ نسخۂ دیوان دوسرے نمبر کا ہے۔ اس سے نسخۂ بھوپال کی توثیق بھی ہوتی ہے اور تصحیح بھی۔ پہلے یہ مولانا محمود خان شیرانی مرحوم کی ملکیت تھا اب یونیورسٹی لائبریری لاہور میں محفوظ ہے۔

اس کی تقطیع $10\frac{1}{2} \times \frac{1}{2}$ ۷ اور متن کا ناپ $3\frac{1}{2}$ انچ ہے - تعداد اوراق ۱۰۹ اور مسطر ۱۱ سطری ہے۔ متن کی روشنائی کالی اور تخلص کی شنگرفی ہے۔ مصرعوں کو جدا کرنے کے لیے درمیان میں سرخ جدولیں ہیں۔ نسخے کے کنارے اور بعض صفحوں کے درمیانی حصے آب زدہ ہیں اور کئی آخری ورق خفیف سے کرم خوردہ بھی ہیں۔

ورق ۱۶ اور ۲۶ کی رکابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بعد ایک ایک ورق کم ہے اور ورق ۱۰۶ کے بعد متعدد اوراق کا نقصان نظر آتا ہے۔ آخر کے ورق بھی مفقود معلوم ہوتے ہیں۔

ورق ۱ الف پر ''دیوان غالب اردو'' لکھا ہے۔ ب، پر سرخ، سبز، نیلی اور سنہری لوح ہے جس کے بیچ میں ''یافتاح''۔ لکھا ہے۔ اس کے بعد ''بسم اللہ'' ہے اور پھر غزلیں شروع ہو کر ورق ۱۰۶ ب پر یکا یک ختم ہو جاتی ہیں۔ ورق ۱۰۷ الف سے ۱۰۹ ب تک نونیہ قصیدہ ہے۔ اس کا آغاز سابق ورق کے ساتھ غائب ہو گیا ہے۔

ساری کتاب کا حاشیہ دہرا ہے ۔ بیرونی حاشیے کی جدول نہایت باریک نیلی ہے ۔ پھر ڈیڑھ انچ جگہ چھوڑ کر اندرونی حاشیے کی جدولیں پہلے نیلی اور پھر دہری سرخ ہیں ۔ ہر دو نظموں کے درمیان ایک سطر پھر سادہ جگہ چھوڑی گئی ہے ۔ جس مقطعے کو دو سطروں میں لکھا ہے (اور پوری کتاب میں عموماً ایسا ہی ہے) اس کے دونوں جانب کی جگہیں سادہ ہیں ۔ ورق ۲ الف کے حاشیے پر صاد بنا کر متداول دیوان کا یہ مقطع نقل کیا گیا ہے :

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

نیز اسی صفحے کے نچلے حاشیے میں نسخے کا "ن" بنا کر "نادیدنی دعوت" کی جگہ" "داغ جگر ہدیہ" لکھا ہے ۔ لیکن یہ اضافہ حال کے کسی شخص کا ہے ۔ ورق ۲ ب کے حاشیے میں "نقش سویدا کیا ہے عرض" کے لفظ "عرض" کی جگہ متداول لفظ "درست" نقل کیا گیا ہے ۔

ورق ۳ ب اور ۴ الف کے حاشیوں میں وہ غزل تحریر ہے جس کا پہلا مصرع ہے : "ستائش گر ہے زاھد اس قدر جس باغ رضواں کا" ، اور اس کا آغاز ان الفاظ سے ہوا ہے "از بانده فرستادند"۔

ورق ۹ الف کے حاشیے میں "ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا" خود غالب نے اپنے قلم سے لکھی ہے ۔ ورق ۳۴ الف کے حاشیے میں "آبرو کیا خاک اس گل کی کہ گلشن میں نہیں" اور "ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں" : خوشخط قلم سے تحریر ہیں اور ان میں سے پہلی کا عنوان ہے "از بانده رسید"

ورق ۳۴ ب کے حاشیے میں سابق غزل کا تتمہ اور یہ نئی

نظم بعنوان غزل اور بخط خوش منقول ہے : ''نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد، نہیں '' ورق ۵۶ الف کے حاشیے میں ''واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو'' ورق ۶۱ الف کے حاشیے میں ''ظلمتکدے میں میرے شب غم کا جوش ہے'' اور ورق ۶۱ الف و ب کے حاشیوں میں ''کب وہ سنتا ہے کہانی میری'' بخط خوش اور بعنوان غزل تحریر ہیں ۔ قلم کا انداز بتاتا ہے کہ یہ سب ''ق'' کے کاتب ہی کے ہاتھ کی ہیں ۔

حسب ذیل مقامات پر مرزا صاحب کے ہاتھ کی اصلاحیں ملتی ہیں :

(۱) ورق ۳۷ ب سطر ۱۰ میں کاتب نے لکھا تھا : گرد ساحل ہے مجھے ، دیکھے ہے وہ جس جا نمک ''مرزا صاحب ''مجھے دیکھے'' کو قلم زد کر کے اوپر ''یہ زخم موجہ'' لکھا اور ''وہ جس'' کو چھیل کر ''در'' بنایا اور ''جا'' کو ''یا'' کر دیا ۔ بعد ازاں سطر ۱۲ میں یہ شعر اپنے قلم سے بڑھایا :

داد دیتا ہے مرے زخم جگر کی ، واہ ! واہ !
یاد کرتا ہے ، مجھے ' دیکھے ہے وہ جس جا نمک

اس اصلاح نے صفحے کی سطروں کی تعداد ۱۲ کر دی ہے ' نیز صفحے کی جدول کے نچلے حصے کو ایک سطر بھر نیچا کرنا پڑا ہے ۔

(۲) ورق ۵۳ الف کے پہلے شعر کے دوسرے مصرع ''یعنی ہمارے جیب میں اک تار بھی نہیں'' کا ، ''نہیں'' ، غالب کے قلم کا اضافہ ہے ۔

(۳) ورق ۷۶ ب پر کاتب نے لکھا تھا :

جنون ، فسردۂ تمکیں ہے ، کاش ، عہد وفا
لہو میں ھاتھ کے بھرنے کی جو وضو جانے

اس شعر میں کاتب نے از راہ سہو پہلے شعر کا دوسرا مصرع اور دوسرے کا پہلا چھوڑ دیا تھا ۔ غالب نے یہ کمی اپنے ھاتھ سے اس طرح پوری کی ہے کہ پہلے کا دوسرا مصرع، مصرعوں کے بیچ کی سادہ جگہ میں اور دوسرے کا پہلا بین‌السطور میں لکھا ہے ۔

(۴) ورق ۱۰۳ الف کے چھٹے شعر :

حیراں ہوں شوخی رگ یاقوت دیکھ کر
یاں ہے کہ صحبت خس و آتش بر آر ہے

میں لفظ ''ھوں'' غالب نے اپنے قلم سے بڑھایا ہے ۔

اس نسخے کا رسم خط وہی ہے ، جو اس زمانے میں مروج تھا ۔ مثلاً اردو فارسی لفظوں میں ''ذ'' پائی جاتی ہے اور ''خورشید'' کو بواؤ ھی لکھا گیا ہے ۔ یہ اس کی دلیل ہے کہ اس وقت تک مرزا صاحب نے املاے الفاظ میں نئی راہ نہیں نکالی تھی ' ورنہ پوری کتاب میں کہیں تو اس قسم کی اصلاح بھی کرتے ۔

۳ ۔ گل رعنا ۔

یہ مرزا صاحب کے اردو اور فارسی کلام کا پہلا انتخاب ہے جو مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش پر کیا گیا تھا ۔

اس کا ایک مخطوطہ محبی مالک رام صاحب کو دستیاب ہوا ہے ۔ وہی میرے پیش نظر ہے ۔ اس کا ناپ $9\frac{1}{2}$ × ۶ ہے مسطر ۱۳ سطری ہے ۔ کاغذ ولائتی باریک اور سفید ہے، خط

معمولی نستعلیق ہے، متن کی روشنائی کالی ہے، تخلص شنجرف سے لکھا گیا ہے۔ جدولیں نیلی اور شنجرفی ہیں۔ کہیں کہیں کرم خوردگی کے نشان بھی پائے جاتے ہیں۔

کتاب میں ۹۴ ورق ہیں۔ ورق ۱ ب سے دیباچہ شروع ہو کر ورق ۴ الف پر ختم ہوتا ہے۔ دیباچے کا آغاز، "لاموثر فی‌الوجود الا للہ" سے اور خاتمہ "۴م شوال سنہ ۱۲ ہجری" پر ہوا ہے۔ ورق ۴ ب سے اردو کلام کا انتخاب شروع ہوا ہے جو ورق ۴۲ الف کی سطر ۵ پر تمام ہو گیا ہے۔ اس کے اردو اشعار کی تعداد بتفصیل ذیل ۴۵۴ ہے:

الف	۱۱۳	ز	۵	گ	۲
ب	۸	س	۵	ل	۳
ت	۵	ش	۲	م	۳
ث	۱	ع	۳	ن	۶۷
ج	۳	غ	۲	و	۱۷
د	۴	ف	۴	ہ	۴
ر	۶	ک	۶	ی	۱۹۲
					۴۵۴

تاریخی ترتیب کے اعتبار سے یہ انتخاب نسخۂ شیرانی (قا) کے بعد کا ہے، کیونکہ اس میں ان غزلوں کا انتخاب بھی شامل ہے، جو ۱۸۲۶ع یا اس کے بعد کہی گئی تھیں اور قا کے حاشیوں میں درج ہیں۔ نیز اس کا متن بھی بالعموم نسخۂ شیرانی کے مطابق ہے [۱۸]"

مولانا امتیاز علی عرشی کے مرتبہ دیوان غالب پر فکر و نظر

(علی گڑھ) میں مفصل تبصرہ کرتے ہوئے مالک رام صاحب ۱۹۶۱ء میں فرماتے ہیں :

"سب سے پہلے ۱۲۰ صفحہ کا مبسوط دیباچہ ہے - اس میں انہوں نے [عرشی صاحب نے] حسب معمول پوری داد تحقیق دی ہے - پہلے مختصراً مرزا کے سوانح حیات خود انہیں کی اردو فارسی نثری تحریروں سے اقتباسات کی شکل میں دیے ہیں، پھر ان کی ریختہ گوئی کے دو دور قائم کیے ہیں پہلا آغاز سخن گوئی (تقریباً ۱۸۰۷) سے لے کر ۲۵ برس کی عمر (یعنی ۱۸۲۲ء) تک اور دوسرا ۱۸۵۰ء سے ان کی وفات (۱۸۶۹ء) تک، درمیانی ۳۰ برس کے لگ بھگ ان کی توجہ بیشتر فارسی پر مبذول رہی، اگرچہ اس زمانے میں بھی وہ تفنن طبع کے لیے کبھی کبھی اردو میں ضرور کہتے رہے اور یہی صورت ریختہ گوئی کے دور ثانی میں بھی ہوئی، یعنی جب وہ ۱۸۵۰ء میں باضابطہ طور پر دربار بہادر شاہی سے وابستہ ہو گئے تو اگرچہ اس کے بعد انہوں نے زیادہ تر اردو ہی میں لکھا، لیکن اس زمانے میں بھی وہ گھے بگاھے فارسی میں لکھتے رہے - تاہم بالعموم یہ بالکل صحیح ہے کہ ان کے اردو اور فارسی گوئی کے دور کم و بیش صحت سے متعین کیے جا سکتے ہیں -

آگے دیوان اردو کی تدوین اور انتخاب کلام پر بحث کی گئی ہے - اس میں شبہہ نہیں کہ تدوین کا کام بہر حال اکتوبر ۱۸۲۱ء سے قبل پورا ہو چکا تھا، جو دیوان کے نسخۂ بھوپال (نسخہ حمیدیہ) کی تاریخ کتابت ہے - اس سے پہلے کسی کا اس طرف خیال نہیں گیا، لیکن جناب عرشی صاحب کی یہ رائے بالکل ٹھیک معلوم ہوتی ہے کہ یہ نسخہ خود مرزا نے اپنے لیے صاف کروایا تھا اور مدتوں ان کے پاس رہا - اس میں،

جیسا کہ سب کو معلوم ہے، ان کا وہ تمام ابتدائی مشکل کلام موجود ہے جسے سن سن کر ان کے بقول 'جاهل ملول ہوتے' تھے یا پھر، سخنوران کامل، ان سے، آسان کہنے کی فرمائش کرتے تھے۔ ان اصحاب کے اصرار پر انہوں نے اسے بہ نظر اصلاح و تغیر و تبدل دیکھنا شروع کیا - اس کا پہلا نتیجہ غالباً وہ قلمی دیوان ہے، جو کسی زمانے میں مولانا محمود خان شیرانی مرحوم کے قبضے میں تھا اور اب ان کے ذخیرۂ کتب کے ساتھ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور میں محفوظ ہے - لیکن ابھی تک متداول دیوان وجود میں نہیں آیا تھا یہ ان کے سفر کلکتہ (اگست ۱۸۲۶ع) سے پہلے کی بات ہے۔ اس تمام رطب و یابس میں سے جواهر تابدار کے انتخاب کا کام مرزا نے کلکتہ میں کیا - یہاں مولوی سراج الدین احمد نے ان سے فرمایش کی کہ میرے لیے اردو اور فارسی کلام کا انتخاب کر دیجیے - اس پر انہوں نے یہ دونوں انتخاب کیے - ان کے لیے خاص طور پر فارسی میں دیباچے اور خاتمے کی عبارتیں لکھیں اور اس مجموعے کا نام "گل رعنا" رکھا - میرے خیال میں اسی زمانے یعنی کلکتے کے قیام کے دوران میں (فروری ۱۸۲۸ع) متداول دیوان بھی مرتب ہوا"۔[۲۹]

اس تبصرے میں آگے چل کر مالک رام لکھتے ہیں :

"مجھے جناب عرشی صاحب سے بعض جزوی اختلافات ہیں - مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اظہار کر دوں :

(۱) ص ۳۴-۳۵ (دیباچہ) فرماتے ہیں :

"خواجہ حالی کے ارشاد کے مطابق مرزا صاحبؒ نے حکیم احسن اللہ خان بہادر کو کلکتے سے لکھ کر بھیجا تھا:

"من و ایمان من کہ بگرد آوردن نثر پراگندہ نہ پرداختہ

و خود را درین کشمکش نینداختہ‌ام ... سطرے چند کہ بدیباچگی دیوان ریختہ، کسوت حرف و رقم پوشیدہ و دود سودائی کہ بآرایش سفینۂ موسوم بہ ''گل رعنا'' از سویدا جوشیدہ است، ارمغان می فرستم و از شرم تنک مایگی آب می گردم'' ۔

مرزا صاحب ۴ شعبان ۱۲۴۳ھ (۱۹ فروری ۱۸۲۸ع) کو کلکتے پہنچے اور ۶ جمادی الثانیہ ۱۲۴۵ھ (۲۸ نومبر ۱۸۲۹ع) کو دھلی واپس آئے تھے ۔ اس حساب سے دیباچے کو مذکورہ بالا تاریخوں سے پہلے اور کار انتخاب کو اس سے بھی قبل انجام کو پہنچ جانا چاھیے، لیکن مولانا نظامی بدایونی مرحوم کو دیوان غالب کا ایک ایسا مخطوطہ ملا تھا ، جس میں دیباچے کی تاریخ ۲۴ ذی قعدہ سنہ ۱۲۴۸ھ درج تھی ۔

لہذا خواجہ صاحب کے بیان کو نظری قرار دے کر تاریخ انتخاب دیوان کو مذکورہ بالا تاریخ سے کچھ پہلے ماننا پڑے گا'' انتہیٰ ۔

دیباچے ہی کے دوسرے مقام (ص ۵۸) سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرزا کے اس خط کو ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۳ع) یعنی اس تاریخ سے بعد کا مانتے ہیں ، جو مولانا نظامی مرحوم کے دریافت کردہ مخطوطے کے دیباچے کی تاریخ تھی ۔

چونکہ اس خط سے دیوان متداول کے انتخاب اور ترتیب کا مسئلہ وابستہ ہے اس لیے اس پر ذرا تفصیل سے گفتگو کرنے کی ضرورت ہے ۔ سب سے پہلے غالب کا پورا خط دیکھیے ۔ لکھتے ہیں :

''دردمند نوازا ! نسیم ورود مشکین رقم نامہ غنچۂ این راز را پردہ کشائے و شمیم این نوید را غالیہ‌سائے آمد کہ روزگار بکزلک مد طول زمان فراق نقش بے اِعتباری ھائے من از

صفحۂ خاطر احباب نسترده و ترکتاز صرصر بیداد جدائی خاکساری ہائے مرا از یاد عزیزان نبرده است -

در معرض طلب نثر فرومانده تر ازان میزبان بے دستگاہم کہ ناگرفت مہمانے عزیزش از راه در رسد و بیچاره بسا بگرد سراپائے سرمایۂ خویشتین بگردد ، تا شوربائے دود پختی و نان کشکینی فراز آرد - من و ایمان من! کہ بگرد آوردن نثر پراگنده نپرداختہ و خود را درین کشاکش نینداختہ‌ام - چہ پیدا است کہ فرو ریختۂ کلک این کس یا نقشے است نژند یا رقمے است فرومند - در صورت اول چہ لازم است خود را بہ فروختن و وبال نظارۂ آئندگان بہ سلم خریدن ، و در شق ثانی اندیشہ می سنجد کہ رفتگان چہ برده اند و گزشتگان چہ یافتہ کہ ما را از روے آن وایہ بیتاب دارد - انصاف بالائے اطاعت است بدعوی‌ِ گاہے کہ توانائی قتیل را بفرهیدگی فرهنگ مسلم داشتہ ولوائے نورالعین واقف بہ شیوائی شیوه بر افراشتہ باشند، با کہ باید گفت کہ نتائج طبع ما کجائی است و مارا چہ مایہ لذت درین جگر خائی است - سطرے چند کہ بدیباچگی دیوان ریختہ کسوت حرف و رقم پوشیده و دود سودائی کہ بآرایش سیفنۂ موسوم با "گل رعنا" از سویدا جوشیده است ، ارمغان می فرستم - و از شرم تنک مایگی آب می گردم - والسلام" -

خواجہ حالی مرحوم کے بیان کے مطابق مرزا نے یہ خط عمدة الحکما احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خان کو کلکتے سے لکھا تھا - فرماتے ہیں :

"حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے مرزا سے جب کہ وہ کلکتے میں مقیم ہیں ، خواہش کی ہے کہ اگر آپ نے اپنی کچھ نثریں جمع کی ہوں تو بھیج دیجیے - اس کے جواب میں مرزا لکھتے ہیں : (اور اس کے بعد یہ خط نقل کیا ہے)" -

اس کے برعکس جناب عُرشی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ ۱۸۳۳ع کے بعد لکھا گیا ہے لہذا حالی کا یہ خیال غلط ہے کہ یہ کلکتے سے لکھا گیا تھا ۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ چونکہ مرزا نے اس خط کے ساتھ اپنے دیوان اردو کا دیباچہ عمدۃالحکما کو بھیجا تھا اور اس دیباچے کی تاریخ اس مخطوطے کے مطابق جو مولانا نظامی بدایونی مرحوم نے کسی جگہ دیکھا تھا ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۸ھ (۱۹ اپریل ۱۸۳۳ع) ہے اس لیے لازم ہے کہ یہ اس کے بعد لکھا گیا ہو ۔

غالب کے خط پر پھر ایک نظر ڈالیے :

(الف) سب سے پہلی بات اس سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ جس زمانے میں احترام‌الدولہ حکیم احسن اللہ خاں نے ان سے نثریں طلب کی ہیں ، مرزا دلی میں نہیں تھے ، بلکہ کہیں باہر گئے ہوئے تھے ۔ اگر وہ دلی میں ہوتے تو حکیم صاحب کو خط لکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی وہ آسانی سے ان سے ذاتی طور پر مل کر یہ مطالبہ کر سکتے تھے ۔

(ب) دوسری بات یہ کہ انہیں دلی سے باہر گئے ہوئے بھی بہت دن ہو چکے تھے اتنے کہ اگر اس عرصے میں ان کے دہلوی احباب خاموش رہتے تو انہیں گمان ہو سکتا تھا کہ وہ انہیں بھول گئے ہیں ۔ اگر یہ مدت اتنی طویل نہیں تو مرزا کا یہ لکھنا کیا معنی رکھتا تھا ۔

"نسیم ورود مشکیں رقم نامہ غنچۂ این راز را پردہ کشائے و شمیم ایں نوید را غالیہ سائے آمد کہ روزگار بکزلک مد طول زمان فراق نقش بے اعتباری‌ہائے من از صفحۂ خاطر احباب نستردہ و ترکتاز صرصر بیداد جدائی خاکساری‌ہائے مرا از یاد عزیزاں نبردہ است"

ار گیہ خط ۱۸۳۳ع سے بعد کے زمانے کا ہے تو کیا
بتایا جا سکتا ہے کہ وہ کب دلی سے اتنی مدت کے لیے
باھر گئے کہ اس پر "مد طول زمان فراق" اور "ترکتاز
صر صر بیداد جدائی" کا اطلاق ہو سکے ؟ ظاھر ہے کہ
غیر حاضری کا یہ زمانہ خاصا طویل ہے ' کیونکہ مرزا
شکر کر رہے ہیں کہ الحمدللہ باوجود کہ مجھے احباب سے
بچھڑے اتنا لمبا زمانہ ہوگیا' وہ مجھے بھولے نہیں - بے شک
ان کی زندگی کے درمیانی زمانے کے تفصیلی حالات ہمارے
علم میں نہیں' لیکن اس میں شبہہ نہیں کہ اگر اتنے
"لمبے زمانے" کی غیر حاضری کلکتے کے سفر کے علاوہ اور
کبھی پیش آئی ہوتی تو کہیں نہ کہیں تو اس کا ذکر ہوتا -

(ج) اس سلسلے میں ایک اور بات بھی غور طلب ہے - مرزا
علی بخش خان نے ' پنج آھنگ کے دیباچے میں لکھا ہے
کہ میں اکتوبر-نومبر ۱۸۳۵ع میں جے پور سے دلی آیا اور
اس کے بعد میں نے مرزا کی فارسی نثریں جمع کرنے کا
کام شروع کیا' بعض تحریریں پہلے سے ان کے اپنے پاس
تھیں' کچھ انہوں نے اور احباب سے (جن میں یقین ہے
کہ بیشتر دلی کے رھنے والے ہوں گے) مہیا کیں اور یوں
ایک معقول مجموعہ مرتب کر لیا - گویا یہ کام ۱۸۳۵ع
کے اواخر میں شروع ہو گیا تھا اور یقیناً مرزا کے سب
دوستوں کو اس کا علم ہو گیا تھا کہ علی بخش خان اِن
کی نثریں جمع کر رہے ہیں - اس صورت میں اس تاریخ
سے بعد کسی شخص کا اور وہ بھی احترام الدولہ کے سے
قریبی دوست کا' خود مرزا سے ان کی نثریں طلب کرنا
حد درجہ بے محل ہوتا - پس اگر یہ خط اپریل ۱۸۳۳ع
سے بعد کا ہے تو پھر لامحالہ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ یہ

اکتوبر ، نومبر یا حد دسمبر ۱۸۳۵ع سے قبل کا ہے کیونکہ اس کے بعد کوئی شخص ان سے یہ نثریں طلب نہیں کر سکتا تھا ۔

کیا کوئی شخص بتا سکتا ہے کہ وہ اپریل ۱۸۳۳ع اور دسمبر ۱۸۳۵ع کے درمیانی زمانے میں کبھی کسی لمبی مدت کے لیے دلی سے باہر گئے تھے (یہ بھی یاد رہے کہ خود اس وقفہ کی پوری میعاد بھی لے دے کے پونے دو برس ہے) ۔

غرض ہر طرح سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرزا نے یہ خط احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خان کو کلکتے ہی سے لکھا تھا اور اس بارے میں حالی کی شہادت درست ہے ۔

(د) اس خط سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ مرزا نے سفر کلکتہ کے دوران میں نہ صرف سفینۂ گل رعنا' مرتب کیا اور اس کے لیے فارسی میں دیباچے اور خاتمے کی عبارتیں قلم بند کیں ، بلکہ جب تک وہ دیوان ریختہ کا دیباچہ بھی لکھ چکے تھے ۔ اس سے منطقی نتیجہ یہی نکلے گا کہ اگر دیباچہ لکھا جا چکا تھا تو دیوان کا انتخاب بھی ہو چکا تھا اور میرے نزدیک اس نتیجے کے تسلیم کر لینے میں کوئی اشکال بھی نہیں ۔

اس میں تو کوئی شبہہ نہیں کہ انہوں نے کلکتے میں مولوی سراج الدین احمد کی فرمایش پر "گل رعنا" مرتب کیا ۔ اس میں اردو کلام کا جو انتخاب ہے اس سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں ، اول یہ کہ کلکتے میں ان کے پاس اپنے مردف دیوان کا نسخہ موجود تھا ، دوم یہ کہ انتخاب انہوں نے اس دقت نظر سے کیا تھا کہ بعد کو اس میں سے صرف ۲۰-۲۵ شعر نظری کرنا پڑے ۔ لیکن اہم ترین بات یہ ہے کہ انہوں نے اس زمانے

میں یقیناً پورا انتخاب کیا ہو گا، یعنی اپنے تمام اردو کلام کا نمائندہ انتخاب ؟ کیونکہ جب وہ انتخاب کر ہی رہے تھے تو کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے صرف مولوی سراج الدین احمد ہی کی خواهش کو مد نظر رکھا اور صرف ۵۵۴ شعر (''گل رعنا'' کا اردو حصہ) ہی انتخاب کیے۔ ان کے دوسرے احباب بھی تو کتنے زمانے سے ان سے آسان کہنے کی فرمایش کر رہے تھے - پس انہوں نے اسی موقع پر پہلے مکمل انتخاب کیا، مشکل اشعار ترک کر دیے اور آسان شعر لے لیے یہ انتخاب کم و بیش یقیناً وہی رہا ہوگا جو رام پوری نسخہ

قدیم (مکتوبہ ۱۸۳۳ء) کے مشتملات ہیں ، یعنی ۱۰۶۷ شعر - اور چونکہ یہ انتخاب طویل تھا ، انہوں نے اس میں سے صرف ۵۵۴ شعر ''گل رعنا'' میں شامل کر لیے غرض ان کا مکمل انتخاب ''دیوان ریختہ'' کہلایا اسی پر وہ دیباچہ لکھا گیا جو انہوں نے حکیم احسن اللہ خان بہادر کو بھیجا تھا - اگرچہ اس کا بھی کچھ یقین نہیں لیکن گمان غالب یہی ہے کہ یہ وہی دیباچہ تھا جو اب دیوان اردو کے آغاز میں ملتا ہے -

اب رہی یہ بات کہ مولانا نظامی بدایونی مرحوم کی نظر سے کوئی ایسا مخطوطہ گزرا تھا، جس میں اس دیباچے کے آخر میں تاریخ ۲۴ - ذی قعدہ ۱۲۴۸ھ درج تھی ، تو اگرچہ ہمیں آج تک یہ نسخہ کسی کتاب خانے میں دستیاب نہیں ہوا جس سے ان کے بیان کی تصدیق ہوتی، لیکن کوئی وجہ نہیں کہ خواہ‌مخواہ ہم ان پر شک ہی کریں - انہوں نے ضرور اسے کسی جگہ دیکھا ہوگا اور شاید کسی نہ کسی دن یہ نسخہ منظر عام پر آ جائے - لیکن اس سے یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ دیباچہ مرزا نے اول مرتبہ اسی تاریخ کو لکھا تھا ! کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ جب

بعد کو انھوں نے یہ منتخب دیوان، اضافوں کے ساتھ لکھنے کے لیے کاتب کے حوالے کیا، تو اس کے ساتھ وہی دیباچہ جو کلکتے کے زمانۂ قیام میں لکھ چکے تھے، شروع میں شامل کر لیا (بشرطیکہ یہ دیباچہ وہی کلکتے والا دیباچہ ہو) اور اس وقت یہ تاریخ اضافہ کردی - یہ محض تاویل ہے ورنہ جب تک نظامی مرحوم والا مخطوطہ دیکھا نہ جائے حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے -

یہاں ضمنی طور پر ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے جناب شیخ محمد اکرام صاحب نے جب اپنے مرتبہ دیوان کے آغاز میں دیباچے کے اختتام پر یہ تاریخ درج کی، تو ساتھ ہی فرمایا کہ انھوں نے یہ کتاب خانہ رضائیۂ رامپور کے کسی قلمی نسخے میں دیکھی تھی - مولانا عرشی مدظلہ، لکھتے ہیں (ص ۳۲۱) کہ رام پور کے کسی قلمی نسخے میں یہ تاریخ نہیں ملتی - ظاہر ہے کہ جناب شیخ صاحب کو یاد نہیں رہا کہ انھوں نے یہ تاریخ کہاں دیکھی تھی - کہیں ایسا تو نہیں کہ انھوں نے نظامی مرحوم کی تحریر پر اعتماد کر کے یہ تاریخ اپنے ہاں لے لی اور خیال کیا کہ مرحوم نے اسے رام پور ہی کے کسی مخطوطہ میں دیکھا ہوگا ؟ موصوف کو چاہیے کہ یہ مسئلہ صاف کر دیں -

غرض مرزا کے اس خط سے، جو انھوں نے احترام‌الدولہ کو لکھا تھا، ظاہر ہے کہ اردو دیوان کا دیباچہ کلکتے میں لکھا گیا تھا اور اس سے بجا طور پر مستنبط ہوتا ہے کہ دیوان متداول بھی (کم از کم اپنی ابتدائی شکل میں) اسی زمانے میں مرتب ہوا تھا - گویا اس کا زمانہ ۱۸۲۸ع ہے[۲۰]"

مالک رام صاحب کے اعتراضات کا جواب جناب عرشی نے رسالہ نقوش کے نومبر ۱۹۶۴ع کے شمارے میں دیا ۔ عرشی صاحب فرماتے ہیں :

"متداول دیوان کی ترتیب و تہذیب دھلی میں ہوئی یا کلکتے میں، اس بارے میں تبصرہ نگار [مالک رام صاحب] کا خیال ہے کہ

(الف) یہ انتخاب کلکتے میں

(ب) گل رعنا کے بعد عمل میں آیا ۔

سوء اتفاق سے گل رعنا کی ترتیب کا سال و ماہ معلوم نہیں ۔ لیکن مرزا صاحب ۱۹ فروری ۱۸۲۸ع کلکتے پہنچے اور ۲۸ نومبر ۱۸۲۹ع کو دھلی واپس آئے تھے لہذا دیوان کے انتخاب کا کام ۱۸۲۹ع کے ابتدائی کسی مہینے میں انجام دیا جانا چاہیے ۔

میری رائے اس سے برعکس یہ ہے کہ دیوان متداول کا انتخاب دھلی میں ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ع) میں کیا گیا تھا ۔ اس رائے کی بنیاد دیباچۂ دیوان کی تاریخ ۲۴ ذی قعد ۱۲۴۸ھ (۱۴—مئی ۱۸۳۳ع) ہے، جو مولانا نظامی بدایونی نے دیوان کے ایک مخطوطے میں پائی اور دیوان غالب مع شرح نظامی کے اس ایڈیشن میں چھاپی جو ۱۹۱۸ع میں مرتب ھوا اور تقریباً اسی سال بازار میں بھی آیا تھا ۔

تبصرہ نگار نے اپنی رائے کی بنیاد مرزا صاحب کے اس خط پر رکھی ہے جو حکیم احسن اللہ خاں بہادر کو لکھا گیا تھا اور اس کے ساتھ دیوان ریختہ کا دیباچہ اور گل رعنا کا

مقدمہ اور خاتمہ بھیجے گئے تھے۔

یہ امر یقینی ہے کہ خط میں نہ مقام کتابت کا ذکر ہے، نہ تاریخ کا۔ صرف خواجہ حالی مرحوم لکھتے ہیں کہ یہ کلکتے سے بھیجا گیا تھا اور اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ اس کا زمانۂ کتابت فروری ۱۸۲۸ع اور نومبر ۱۸۹۲ع کے مابین ہے"۔ "میں یہ تسلیم کئے لیتا ہوں" [واوین میرے ہیں—وحید] کہ مذکورہ خط کلکتے ہی سے لکھا گیا تھا اور "اسے بھی مانے لیتا ہوں" [واوین میرے ہیں—وحید] کہ اسی سفر میں یہ دیباچہ لکھا گیا تھا مگر اس خط کی عبارت سے یہ کب اور کیسے ثابت ہوا کہ:

(الف) یہ دیباچہ موجودہ متداول منتخب دیوان کے لیے لکھا گیا تھا۔

(ب) یہ کہ متداول دیوان کی ترتیب کلکتے میں عمل میں آئی اور

(ج) یہ ترتیب گل رعنا کے متصل بعد کا کام ہے۔

یہ سب جانتے ہیں کہ مرزا صاحب نے سفر کلکتہ سے پہلے اپنے دیوان قدیم کا (جو آج کل نسخہ بھوپال یا مطبوعہ شکل میں نسخہ حمیدیہ کہلاتا ہے) انتخاب کیا تھا اور اس کے بہت سے اشعار ہی نہیں بلکہ پوری غزلیں غلط اور خارج قرار دے دی تھیں۔ اس انتخاب کی ایک کاپی لاہور میں محفوظ اور آج کل نسخۂ شیرانی کے نام سے مشہور ہے۔ زیر بحث دیباچے کے مندرجات میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی جو متداول انتخاب کے ساتھ مخصوص ہو اور نسخہ شیرانی میں پائی جاتی ہے؛ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ دیباچہ انتخاب اول (نسخۂ شیرانی) کے لیے لکھا گیا تھا اور کلکتے ہی میں لکھا گیا تھا۔ جب دھلی میں متداول انتخاب عمل میں آیا تو اس پر بھی اس دیباچے کے مندرجات پوری طرح صاد آتے تھے

اس لیے مرزا صاحب نے اس میں کوئی تبدل وغیرہ نہ کیا - صرف تاریخ بدل دی یا اس میں تاریخ نہ تھی تو اس کا اضافہ کر دیا -

تبصرہ نگار نے یہ بھی فرمایا ہے کہ انہوں نے اس زمانے (قیام کلکتہ) میں یقیناً پورا انتخاب کیا ہو گا ، یعنی اپنے تمام اردو کلام کا نمائندہ انتخاب' کیونکہ جب وہ انتخاب کر ہی رہے تھے تو کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے صرف مولوی سراج الدین احمد ھی کی خواھش کو مدنظر رکھا اور صرف ۴۵۵ شعر (گل رعنا کا اردو حصہ) ہی انتخاب کیے - ان کے دوسرے احباب بھی تو کتنے زمانے سے ان سے آسان کہنے کی فرمائش کر رہے تھے -

پس انہوں نے اسی موقع پر پہلے مکمل انتخاب کیا ، مشکل اشعار ترک کر دیے اور آسان شعر لے لیے -

یہ انتخاب کم و بیش وھی رہا ہو گا جو رامپوری نسخۂ قدیم (مکتوبہ ۱۸۳۳ع) کے مشتملات ہیں یعنی ۱۰۶۷ شعر اور چونکہ یہ انتخاب طویل تھا انہوں نے اس میں سے صرف ۴۵۵ شعر گل رعنا میں شامل کر لیے - غرض ان کا مکمل انتخاب دیوان ریختہ کہلایا -

اس بارے میں میری گزارش یہ ہے کہ :

(الف) گل رعنا پہلے مرتب ہوئی اور

(ب) دیوان متداول کا انتخاب اس کے بعد، عمل میں آیا

اس کی دلیل یہ ہے کہ :

۱ ۔ گل رعنا میں ایسے متعدد پرانے شعر پائے جاتے ہیں جو متداول دیوان میں نہیں ہیں اگر گل رعنا کی بنیاد یہ دیوان ہوتا ، تو چاہیے تھا کہ معاملہ برعکس ہوتا، یعنی دیوان متداول میں ایسے شعر پائے جاتے جو گل رعنا میں نہ ہوتے مثالاً چند شعر پیش کرتا ہوں :

کس قدر خاک ہوا ہے دل مجنوں یا رب
نقش ہر ذرہ سویدائے بیابان نکلا

شب کہ ذوق گفتگو سے تیرا دل بیتاب تھا
شوخیٔ وحشت سے افسانہ فسون خواب تھا

واں ھجوم نغمۂ ھالے ساز عشرت تھا اسد
ناخن غم یاں سر تار نفس مضراب تھا

ہم نے وحشت کدۂ بزم جہاں میں جوں شمع
شعلۂ عشق کو اپنا سر و سامان سمجھا

اے والے غفلت نگہ شوق ، ورنہ یاں
ہر پارہ سنگ، لخت دل کوہ طور تھا

ربط یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ ، صبا آوارہ، گل نا آشنا

مندرجہ بالا شعر گل رعنا میں ہیں اور متداول دیوان میں نہیں ۔

۲ ۔ دیوان قدیم کی کچھ غزلیں ایسی ہیں جن کا کوئی ایک شعر بھی متداول میں نہیں لیا گیا ہے مگر گل رعنا میں ان کے اشعار موجود ہیں ۔ اگر متداول دیوان مقدم اور گل رعنا

موخر ہوتا تو معاملہ برعکس ہونا چاہیے تھا - مثال کے طور پر یہ اشعار پیش ہیں :

برہن شرم ہے باوصف شوخی اہتمام اس کا
نگیں میں جوں شرار سنگ ناپیدا ہے نام اس کا

مسی آلودہ ہے مہر نوازشنامۂ ظاہر ہے
کہ داغ آرزوے بوسہ دیتا ہے پیام اس کا

بامید نگاہ خاص ہوں' محمل کش حسرت
مبادا ہو عناں گیر تغافل لطف عام اس کا

وحشت نالہ بواماندگی وحشت ہے
جرس قافلہ یاں دل ہے گرانباروں کا

پھر وہ سوے چمن آتا ہے خدا خیر کرے
رنگ اترتا ہے گلستان کے ہواداروں کا

جلوہ مایوس نہیں یہ دل نگراں' غافل
چشم امید ہے روزن تری دیواروں کا

قیس بھاگا شہر سے شرمندہ ہو کر سوے دشت
بن گیا تقلید سے میری یہ سودائی عبث

کون آیا جو چمن بیتاب استقبال ہے
جنبش موج صبا ہے شوخی رفتار باغ

آتش رنگ رخ ہر عمل کو بخشے ہے فروغ
ہے دم سرد صبا سے گرمیٔ بازار باغ

یہ سب شعر ایسی غزلوں کے ہیں جن کا کوئی ایک شعر بھی دیوان متداول میں نہیں ہے ۔ اگر گل رعنا کو دیوان متداول سے انتخاب کیا گیا ہوتا تو کیا گل رعنا میں وہ شعر آ سکتے تھے جو اس کی اصل میں نہ ہوتے؟

۳ ۔ بہت سے اشعار ایسے ہیں جن کا متن گل رعنا میں دیوان متداول سے مختلف ہے مثلاً :

تھی نو آموز فنا ہمت دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

اس کا مصرع اول گل رعنا میں یوں ہے :

ہے نو آموز فنا ہمت دشواری شوق
شب کہ برق سوز دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوالہ ہر یک حلقۂ گرداب تھا

گل رعنا میں پہلا مصرع یوں تھا :

شب کہ برق سوزدل سے زہرہ از بس آب تھا
جاتا ہوں داغ حسرت ہستی لیے ہوئے
ہوں شمع کشتہ در خور محفل نہیں رہا

گل رعنا میں دوسرے مصرع کا پہلا لفظ ہے "جوں"

بیداد عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسد
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

گل رعنا میں پہلا مصرع یوں ہے :

بیداد عشق سے نہیں ڈرتا ہوں پر اسد
کیا کہوں بیماریٔ غم کی فراغت کا بیاں
جو کہ کھایا خون دل بے منت کیموس تھا

گل رعنا میں ہے :

پوچھ مت بیماری غم کی فراغت کا بیاں

نسخۂ عرشی کے باب "اختلاف نسخ" میں اور بہت سی مثالیں موجود ہیں جنہیں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان مواقع پر گل رعنا اور دیوان متداول کا اختلاف کیوں ہے ؟ اس کا ایک جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ دیوان متداول میں سے گل رعنا کا حصۂ اردو انتخاب کرتے وقت مرزا صاحب نے اپنے اشعار میں اصلاح کر دی تھی۔ بالفاظ دیگر گل رعنا کا متن متأخر اور اصلاحی ہے اور دیوان متداول مقدم اور متروک۔ لیکن ایسا کہنا درست نہ ہوگا اس لیے کہ ان جگہوں پر گل رعنا کا متن دیوان کے انتخاب اول، یعنی نسخہ شیرانی ہی کی بناء پر گل رعنا بنا ہونا چاہیے، دیوان متداول پر نہیں۔ اور اس صورت میں دیوان متداول کی ترتیب گل رعنا کے بعد عمل میں آنا چاہیے نہ کہ اس سے پہلے۔

اس بات کے ثابت ہو جانے کے بعد کہ دیوان متداول کی ترتیب گل رعنا کے بعد عمل میں آئی یہ مسئلۂ حل طلب رہ جاتا ہے کہ یہ کام کب کیا گیا ؟ چونکہ دیوان کے ایک نسخے میں ۲۴ - ذیقعد ۱۲۴۸ھ موجود ہے اور کوئی اور تاریخ دیوان یا کسی اور کتاب میں مذکور نہیں اس لیے اس نص جلی کو قیاس کے زور پر رد نہیں کیا سکتا" ۲۱

مالک رام صاحب نے ۱۹٦۸ع میں گل رعنا' کے اردو حصے پر بحث کرتے ہوئے بعض امور پر عرشی صاحب سے

اختلاف کیا، نذر ذاکر[۲۲] میں بعض امور زیر بحث آئے ہیں جن کا تعلق نسخہ بھوپال اور نسخۂ شیرانی سے ہے۔ متعلقہ مقالے کا اقتباس ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

"اب تک مرزا کے اردو کلام کا سب سے پرانا مخطوطہ جو منظر عام پر آیا ہے وہی ہے جو نسخۂ حمیدیہ کے نام سے شایع ہو چکا ہے۔ اس کے آخر میں کتابت کی تاریخ ۵ صفر ۱۲۳۷ھ (یکم نومبر ۱۸۲۱ع) درج ہے، جب مرزا کی عمر ۲۴ سال کی تھی اور انہیں شعر کہتے غالباً ۱۲—۱۴ برس ہو چکے تھے۔ نسخۂ حمیدیہ میں بہت سا کلام حاشیے میں بھی درج ہے، بہر حال یہ مسلمہ بات ہے کہ جو کلام متن میں ہے وہ یقیناً اس نسخے کی تاریخ کتابت یعنی ۱۸۲۱ع سے پہلے کا کہا ہوا ہے۔ لیکن حاشیے کا اضافی کلام کب کہا گیا تھا اس سے متعلق ہم یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔

تاریخی ترتیب سے نسخۂ حمیدیہ کے بعد وہ قلمی نسخہ آتا ہے جو حافظ محمود شیرانی کی ملکیت تھا اور اب پنجاب یونیورسٹی (لاہور) کے کتاب خانے میں محفوظ ہے۔ چونکہ نسخۂ حمیدیہ کے متن اور حاشیے کا تمام کلام اس کے متن اصلی میں ملتا ہے اس لیے اسے نسخہ حمیدیہ کا مبیضہ کہا گیا ہے[۲۳] لیکن خود اسی خطی نسخے کے حاشیے میں بھی کچھ ایسا کلام ملتا ہے جو بظن غالب خود غالب نے اس کے مالک کو اپنے سفر کلکتہ کی مختلف منازل سے بھیجا تھا۔ چنانچہ جہاں یہ غزلیں حاشیے میں لکھی ہیں وہاں ان میں سے بعض پر یادداشت لکھی ہے، "از باندہ رسید" یا "از باندہ فرستادند" وغیرہ۔ اس نسخے کے حاشیے پر ایک غزل (ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا) خود غالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ملتی ہے۔ دو ایک

جگہ متن میں تصحیح بھی ان کے قلم سے ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کتاب کا مالک ان کا کوئی دوست تھا جسے وہ غزلیں بھیجتے رہے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ یہ نسخہ در اصل نواب ضیاءالدین احمد خاں نیر و رخشاں یا ناظر حسین مرزا ــــ دونوں میں سے کسی کی ملکیت. رہا ہو گا۔ بہر حال اس نشان دہی سے ایک بات صاف ہو گئی کہ اس نسخے کے متن کا کلام ۱۹۲۷ء [۱۸۲۷ء] (سفر کلکتہ) سے پہلے لکھا جا چکا تھا اور لازماً انہوں نے اس سے پہلے کہا ہو گا۔ اس کی تصدیق گل رعنا کے اس نسخے سے بھی ہوتی ہے، بہت سی ان غزلوں کا جو شیرانی کے نسخے میں ہیں، یہاں انتخاب موجود ہے۔

تاریخی ترتیب میں گل رعنا کا نیا کلام نسخۂ شیرانی کے بعد آئے گا۔ منجملہ اور باتوں کے گل رعنا کی ایک بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس سے ہمیں یقینی طور پر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ۱۸۲۱ء (نسخۂ حمیدیہ کی تاریخ کتابت) اور ۱۸۲۸ء (گل رعنا کا سال ترتیب) کے درمیانی زمانے میں کون سا کلام کہا گیا تھا۔ گویا غالب کے کلام کی تاریخ تدوین اور اس کے متن کے تدریجی ارتقا و تعین کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

نسخۂ حمیدیہ سے ایک بات کا پتا چلتا ہے یعنی اگر متداول دیوان میں مثلاً سات شعر ہیں تو اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ یہ سب کے سب ایک ہی وقت میں کہے گئے تھے۔ اس نسخے کے متن میں کئی ایسی غزلیں ہیں جن میں بعض نئے شعر بعد کو حاشیے پر اضافہ کیے گئے ہیں۔ مرتب (مفتی محمد انوارالحق مرحوم) کے خیال میں یہ اضافے خود غالب کے

لکھے ہوئے ہیں یعنی جب یہ قلمی نسخہ ان کے ملاحظے کے لیے گیا تو انھوں نے نہ صرف متن میں لکھے ہوئے کلام کی اصلاح کی بلکہ اگر کسی پرانی زمین میں کوئی نیا شعر ہو گیا تو اسے بھی حاشیے میں لکھ دیا ، پس اگرچہ وہ غزل بہت پہلے کی تصنیف ہے لیکن اس کا خاص وہ شعر بعد کا کلام ہے ۔ اس طرح کے کئی شعر زیر نظر گل رعنا کے متن میں موجود ہیں جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کس زمانے میں کہے گیے تھے ۔

یہاں ایک غلطی کا ازالہ کر دینا بے جا نہیں ہو گا ۔ نسخۂ حمیدیہ کے حواشی کے بارے میں مفتی محمد انوارالحق کا یہ کہنا ہے کہ یہ غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں ٹھیک نہیں ، ان میں سے بیشتر اضافوں کا خط غالب کے خط سے بالکل نہیں ملتا ۔ یہ اضافے کسی اور شخص کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں ''۳۲

''نسخۂ حمیدیہ اور میاں فوجدار خاں'' کے عنوان سے نادم سیتاپوری صاحب نے ایک مقالہ لکھا ہے جو فروغ اردو (لکھنؤ) کے غالب نمبر ۱۹۶۹ء میں شایع ہوا ہے ۔ اس مقالے میں بھی ضمناً نسخۂ شیرانی کا ذکر آیا ہے ۔ فرماتے ہیں :

''غالب کے اردو اور فارسی کلام کے جتنے قلمی نسخے اب تک دستیاب ہوئے ہیں ان میں اس اردو مخطوطہ [نسخہ حمیدیہ = نسخہ بھوپال] کو اولیت کا شرف حاصل ہے جس کی تقریبی تاریخ ۱۲۳۷ھ مطابق ۱۸۲۱ع کو کہا جا سکتا ہے ۔ دوسرے مخطوطے ''نسخۂ شیرانی'' کے بارے میں دو متضاد رائیں پائی جاتی ہیں ؛ مولانا عرشی نے اسے

۱۲۴۲ھجری (مطابق ۱۸۲۶ع) کا مخطوطہ قرار دیا ہے اور جناب محمد اکرام نے اس کا سنہ کتابت ۱۸۸۷ع تحریر فرمایا ہے اس کے بعد گل رعنا (۱۲۴۵ھ مطابق ۱۸۲۹ع) اور پھر نسخۂ رامپور (۱۲۴۸ ہجری مطابق ۱۸۳۲ع) اپنی قدامت کے اعتبار سے قدیم مخطوطات میں شمار کیے جاتے ہیں''۔۳۵

(۲)

گذشتہ صفحات میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے غالب شناسوں کے وہ بیانات جو کسی نہ کسی پہلو سے نسخۂ شیرانی سے متعلق تھے ۔ ان میں کئی درج شدہ معلومات دو قسم کی ہیں : اول وہ جن میں قلمی نسخے کی تفصیلات دی گئی ہیں ، دوم وہ اختلافی مسائل جن میں غالب شناسوں نے ایک دوسرے کے بیانات کی تردید و تنسیخ کی ہے ۔ ذیل میں پہلے قسم کے معلوماتی مواد کو یک جا کر کے نسخۂ حمیدیہ اور نسخۂ شیرانی کے بارے میں بعض اہم امور کی وضاحت کی جائے گی نیز محققین کے بیانات کی صحت یا عدم صحت کا جائزہ لیا جائے گا ۔

غالب کے اردو کلام کے جو معاصر قلمی نسخے معلوم ہیں ، وہ یہ ہیں :

(۱) نسخۂ بھوپال ۔ جس کا سنہ کتابت ۵ صفر ۱۲۳۷ [اکتوبر ۱۸۲۱ع] ہے

(۲) نسخہ شیرانی جس میں کوئی ترقیمہ نہیں ۔ قیاساً ۱۲۴۳ھ/ ۱۸۲۶ع ۔

(۳) گل رعنا [تاریخ ترتیب سابین ۴ شعبان ۱۲۴۳ و

ربیع الاول ۱۲۴۵ھ/۱۹-فروری ۱۸۲۸ع---ستمبر ۱۸۲۹ع]

(۴) نسخۂ رامپور (قدیم) مکتوبہ ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۳ع

(۵) نسخۂ بدایوں [مابین ۱۲۵۲ھ-۱۲۵۴ھ/۱۸۳۵ع-۱۸۳۸ع-۱۸۳۹ع] -

(۶) نسخۂ کراچی ۲۶ شعبان ۱۲۶۱ھ/اگست ۱۸۴۵ع

(۷) نسخۂ لاہور قیاساً ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ع

(۸) نسخۂ رامپور جدید [اندازاً ۱۲۷۱ھ مابین مارچ ۱۸۵۵ع، ستمبر ۱۸۵۵ع]

(۹) نسخۂ طاہر مکتوبہ ۶ جمادی الثانی ۱۲۷۷ھ/۲۲ دسمبر ۱۸۶۰ع

(۱۰) انتخاب غالب، ۱۲۸۳ھ ۱۸۶۶ع[۲۶]

غالب شناس ان نسخوں کا ذکر عموماً نسخۂ بھوپال، نسخۂ شیرانی، گل رعنا[۲۷]، نسخہ رامپور (قدیم)، نسخۂ بدایوں[۲۸] نسخۂ کراچی[۲۹] نسخۂ لاہور[۳۰] نسخۂ رامپور جدید، نسخۂ طاہر[۳۱] اور انتخاب غالب کے طور پر کرتے ہیں[۳۲]۔

زیر نظر مسائل کے لیے سر دست صرف تین مخطوطے اہمیت رکھتے ہیں، نسخۂ بھوپال، نسخۂ عرشی اور گل رعنا ۔

(۳)

نسخۂ بھوپال: غالب کے منظوم کلام کے دریافت شدہ نسخوں میں یہ قدیم ترین ہے۔ مدت تک یہ قلمی دیوان گوشۂ گمنامی میں پڑا رہا ۔ ابھی دیوان دریافت نہیں ہوا تھا کہ انجمن ترقی اردو

(چند) کو دیوان غالب کی ترتیب کا خیال ہوا ۔ اول دیوان کا متن سید ھاشمی فریدآبادی صاحب سے مرتب کرایا گیا اور دیباچے کی تحریر کا کام ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے سپرد ہوا ۔ بجنوری مرحوم نے دیباچے کی تحریر کے دوران میں بعض مشکل مسائل کے حل میں دوسروں سے مدد بھی لی ۔ فرماتے ہیں :

"لیکن سب سے بڑا مسئلہ ابھی حل نہیں ہوا ۔ "تکیہ" والی غزل پوری لکھ کر بھیجتا ہوں سید ھاشمی نے جو دیوان کا اپنا ایڈٹ کیا ہوا نسخہ مجھے دیا ہے اس میں یہ غزل نواب صاحب کے حوالے سے درج ہے ۔

اس کی تحقیق نواب صاحب سے مقصود ہے ۔

جہاں تک میں مرزا صاحب کے کلام اردو سے واقفیت رکھتا ہوں زمین آسمان ٹل جائیں لیکن یہ ان کا کلام نہیں ہو سکتا ۔ اس کی تحقیق سخت ضروری ہے ۔

اگر یہ غزل ان غزلوں میں جو بعد میں حاشیہ پر اضافہ کی گئی ہیں موجود ہے ، تو یہ دیکھنا چاہیے کہ کس شخص کے خط میں لکھی ہوئی ہے ۔ آیا وہ خط تحقیق ہوتا ہے یا نہیں ۔
دوسرے نواب صاحب کو اس کے بارے میں ذاتی علم کیا ہے ۔
تیسرے نواب صاحب کی اس کے بارے میں رائے کیا ہے ۔
"طائر دل" جو قطعہ ہے وہ بھی مرزا کا نہیں ہو سکتا ۔ اس کے بارے میں بھی نواب صاحب سے جو کچھ مطابق یا مخالف معلوم ہو سکے نوٹ کر لیجیے گا ۔

زیادہ

عبدالرحمٰن"[۳۳]

اقتباس بالا میں نواب صاحب سے مراد نواب احمد سعید خاں طالب پسر نواب ضیاء الدین نیر رخشاں ہیں[۳۴]۔ تکیہ والی غزل جس کا حوالہ دیا گیا ہے۔ ۲۲ جولائی ۱۹۱۴ء کو الہلال کلکتہ میں مولانا ابوالکلام آزاد نے شائع کی تھی[۳۵]۔ بجنوری اسی غزل کے بارے میں شعیب قریشی سے استفسار کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے مکتوب الیہہ بھی دلی میں قیام فرما ہو کہ نواب صاحب کا قیام اس زمانے میں دلی میں تھا[۳۶] ان سے پوچھ کر بتانے کی تاکید کی گئی ہے[۳۷]۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیباچے کی تحریر کے بعد بھوپال کا نسخہ بھی بجنوری کے سامنے آ گیا تھا۔ انہوں نے اسے شائع کرنے کی ٹھانی تھی[۳۸] اور اس کام کے لیے انجمن ترقی اردو سے بات بھی ہوگئی۔ لیکن نومبر ۱۹۱۸ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ انہوں نے متن کی درستی میں کوئی اہتمام کیا یا نہیں، اس کی خبر نہیں بہر حال اتنا یقینی ہے کہ بھوپال کا یہ نادر قلمی نسخہ ان کے زیر مطالعہ رہا لیکن وہ اپنے لکھے ہوئے دیباچے میں اس نسخے کی مدد سے کوئی ترمیم یا اضافہ نہیں کر پائے تھے۔ ان کا دیباچہ اول "محاسن کلام غالب" کے نام سے رسالہ اردو میں جنوری ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا اس کے بعد اسی سال کے آخر میں یہ دیباچہ کتابی صورت میں چھپ گیا۔ نسخۂ بھوپال پر مبنی متن کی اشاعت ریاست بھوپال کی طرف سے ہوئی اور یہ کام مفتی انوارالحق صاحب نے کیا۔ اس طباعت میں بجنوری کا کتابچہ بطور دیباچہ شامل ہے۔ دیوان غالب کا اصل قلمی نسخہ کتب خانۂ حمیدیہ میں تھا جن صاحبوں نے نسخے کو دیکھا ہے ان کے بیان کے مطابق نسخے کے ترقیمے میں یہ لکھا ہے کہ اس نسخے کی کتابت حافظ معین الدین نے ۵ صفر ۱۲۳۷ھ میں مکمل کی۔ نسخے پر نواب فوجدار محمد خاں کی ملکیت کے شواہد

سہیا ہیں ایک مہر ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء) اور دوسری ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) کی ثبت ہے۔

اس کے علاوہ نسخے پر دو اور ناموں کا پتا چلتا ہے عبدالعلی اور عبدالصمد مظہر۔ عرشی صاحب کا ارشاد بجا معلوم ہوتا ہے کہ اول یہ قلمی نسخہ غالب کے لیے لکھا گیا، پھر عبدالعلی اور عبدالصمد مظہر سے ہوتا ہوا نواب فوجدار خاں کے پاس (۱۲۴۸ھ کے بعد) پہنچ گیا۔ وہاں سے کس طرح حمیدیہ لائبریری میں پہنچا اس کی روداد نادم سیتا پوری کے سابق الذکر مقالے میں پائی جاتی ہے[۳۹]۔ ذیل میں اسی مقالے اور کسی قدر مزید مواد سے نواب فوجدار خاں کی نواب حمیداللہ خاں سے عزیزداری کا حال شجرے کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ (شجرہ صفحہ ۷۲ پر ہے)

نسخۂ بھوپال ۱۹۴۴ء تک حمیدیہ لائبریری میں موجود تھا۔ اس سلسلے میں آخری شہادت جناب امتیاز علی عرشی کی ہے جنھوں نے ۱۹، ۲۰، ۲۱ جنوری ۱۹۴۴ء کو کل ہند انجمن ترقی اردو کے اجلاس ناگپور[۴۰] کے بعد بھوپال میں اپنے دو روزہ قیام کے زمانے میں اس نسخے سے استفادہ کیا۔ نسخۂ بھوپال کی گمشدگی کی مختلف روایات بیان کی جاتی ہیں[۴۱] لیکن مذکورہ بالا سنہ تک اس کی لائبریری میں موجودگی سے یہ روایات باطل ٹھرتی ہیں۔ نسخۂ بھوپال کے بارے میں غالبؔ شناسوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نسخے کے متن کی کتابت ۵ صفر ۱۲۳۷ھ (مطابق اکتوبر ۱۸۲۱ء) مکمل ہوئی۔ بعد کی کہی ہوئی غزلیں اور اشعار حاشیے پر درج ہیں۔ نسخے کے خاتمے پر سادہ اوراق پر ردیف "ے" کی اضافہ شدہ غزلیں بھی ہیں۔ نسخے پر جا بجا حک و اصلاح اور ترمیم و اضافہ کیا گیا ہے جس کے دو خط ہیں، ایک موٹا اور بھدا دوسرا باریک۔ ان اصلاحوں کے بارے میں اس پر سب متفق

دوست محمد خاں (بانیِ سلطنت) وفات ۱۱۵۲ھ

نواب یار محمد خاں ---- جلوس ۱۱۵۲ھ ؛ وفات ۱۱۶۶ھ

نواب فیض محمد خاں (فرمانروا) لاولد
جلوس ۱۱۶۶ھ ؛ وفات ۱۱۹۱ھ

نواب حیات محمد خاں (فرمانروا)
جلوس ۱۱۹۲ھ ؛ وفات ۱۲۲۳ھ / ۱۸۰۶ء

نواب غوث محمد خاں
جلوس ۱۲۲۲ھ / ۱۸۰۷ء ؛ وفات ۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۴ء

نواب معز محمد خاں
وفات ۲۷ جمادی الآخر ۱۲۷۷ھ

نواب قدسیہ بیگم (فرمانروا) شادی نظر محمد خاں ابن وزیر الدولہ وزیر محمد خاں سے ۱۲۳۲ھ میں ہوئی۔
جلوس ۱۲۳۵ھ ؛ وفات ۱۲۹۰ھ

میاں فوجدار محمد خاں
وفات ۱۲۸۱ھ

نواب سکندر بیگم (فرمانروا)

شاہجہاں بیگم ۱۲۸۵ھ

سلطان جہاں بیگم

حمید اللہ خاں

یار محمد خاں شوکت
(شاگردِ غالب)
۲۸ صفر ۱۲۵۹ھ [1]

[1] مجموعۂ غلط نامۂ شہنشاہ نامہ مصنفہ یار محمد خاں بشکریہ ڈاکٹر حامد حسین۔

ہیں کہ مصنف کی ہیں اور بعد کی روائتیں (versions) اسی اصلاح شدہ شکل کے مطابق ہیں؟ لیکن آیا یہ تحریریں خود غالب کے قلم سے ہیں یا نہیں اس کے بارے میں محققین متفق نہیں۔ عرشی صاحب اپنے مطبوعہ متن (نسخۂ عرشی) میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر پائے (وہ اب لکھتے ہیں کہ ان کے نزدیک اغلاط کتابت — جن پر انہوں نے پہلے حیرت کا اظہار کیا تھا۔

قطعی طور پر کسی دوسرے قلم کی ہے[۴۲]) نسخۂ بھوپال غالب کے کلام کی تاریخی تدوین کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے متن میں درج شدہ کلام یقیناً ۵ صفر ۱۲۳۷ھ سے قبل کا ہے۔ ڈاکٹر شیخ محمد اکرام نے کلام غالب کے عہد بہ عہد ارتقا کے سلسلے میں نسخۂ بھوپال کی غزلوں کو ۱۸۲۱ع تک کے لیے، یعنی غالب کے اردو کلام کے دور اول کے طور، پر استعمال کیا ہے اور نسخۂ شیرانی کی غزلوں کو ۱۸۲۱ع سے ۱۸۲۷ع تک کے دور سے مخصوص کیا ہے؛ لیکن غالب نامے اور آثار غالب وغیرہ سے یہ نہیں کھلتا کہ نسخۂ بھوپال کے حاشیوں کی غزلوں کو کس سنہ کی قرار دیتے ہیں۔ قاضی عبدالودود صاحب ۱۹۵۷ع یا ۱۹۵۸ع سے دو چار سال قبل نسخۂ بھوپال کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ نسخہ ۱۹۵۴ع یا اس سے کچھ قبل غائب ہو چکا تھا[۴۳]۔ اس لیے وہ اس سے براہ راست استفادہ نہیں کر پائے۔ نسخۂ بھوپال کے بارے میں قاضی صاحب کا ارشاد یہ بھی ہے کہ اس میں کی کئی چھٹی غزلیں غالب کی اصلاحوں سے مزین ہیں لیکن ان کے کاتب غالب ہیں یا نہیں ان کے بارے میں وہ نسخے کو دیکھے بغیر کچھ کہنے سے قاصر ہیں۔ جہاں تک نسخۂ بھوپال کے اضافات اور اصلاحات کا تعلق ہے ان کا ارشاد یہ ہے کہ اس کا امکان بھی ہے کہ ۵ صفر ۱۲۳۷ھ سے قبل کچھ اضافے اور اصلاحات

کی گئی ہوں"——یعنی قاضی صاحب کو یہ شبہہ بھی ہے کہ نسخے کے حواشی پر اضافے اور ترمیمیں ۵ صفر ۱۲۳۷ھ سے قبل کی ہوں لیکن حاشیے پر درج شدہ نئی غزلوں کے بارے میں وہ خاموش ہیں۔ میرا قیاس ہے اس کا امکان نہیں کہ پوری کی پوری نئی غزلیں ۵ صفر ۱۲۳۷ھ سے قبل ہی حاشیوں پر درج کی گئی ہوں۔ نسخۂ بھوپال کے بارے میں ان کی رائے یہ بھی کہ اس میں غالب کا ۱۲۳۷ھ تک کا کہا ہوا کل کلام نہیں ہے۔ اس سلسلے میں قاضی صاحب غالب کی ایک غزل کا ذکر کرتے ہیں جو اس سنہ سے قبل کی ہے لیکن نسخۂ بھوپال میں نہیں ہے[۴۴]

کیا قاضی صاحب اس سے یہ نتیجہ نکال چکے ہیں کہ نسخۂ حمیدیہ بھی نسخۂ شیرانی اور مروجہ دیوان کی طرح چونکہ کل کلام کو حاوی نہیں اس لیے یہ بھی "انتخاب" ہے، اس کے بارے میں کچھ کہنا ممکن نہیں۔ البتہ عرشی صاحب کے بارے میں ہمیں حتماً معلوم ہے کہ وہ نسخۂ بھوپال کو (بعض اشعار کی عدم موجودگی کے باوجود) غالب کا پورا کلام اور نسخۂ شیرانی کو منتخب کلام کا مجموعہ جانتے ہیں اور نسخۂ شیرانی کو انتخاب کہتے ہیں۔ عرشی صاحب کے بیان کے مطابق غالب نے اپنے اردو اور فارسی کلام کی جمع و تدوین کا ابتدائی کام خود انجام دیا (وہ آزاد کی اس روایت کو نہیں مانتے کہ غالب کے احباب نے اس کا کلام منتخب کیا۔ فی الحقیقت ان کا موقف صحیح بھی ہے) نسخۂ بھوپال کی تدوین کے وقت مرزا کے پاس "اول کوئی بیاض تھی یا مردف دیوان تھا" اس کے بارے میں بقول عرشی یقینی طور پر کچھ کہنا ممکن نہیں، تاہم اتنا معلوم ہے کہ ۱۲۳۷ھ سے قبل کے متعدد اشعار (جو عمدۂ منتخبہ، عیارالشعرا اور قدیم ماخذوں میں موجود ہیں) مرزا نے نسخۂ بھوپال کی تدوین کے وقت خارج کر

دیے تھے ۔ عرشی صاحب کے یہ بیانات کسی قدر تفصیلی جائزے کے محتاج ہیں اس پر دو تنقیحیں قائم ہوتی ہیں :

(الف) عمدۂ منتخبہ اور عیارالشعراء وغیرہ قدیم ماخذوں کا درج شدہ زائد کلام ۱۲۳۷ھ سے قبل کا ہے ۔

(ب) نسخۂ بھوپال اس وقت تک کے غالب کے کل کلام کا مجموعہ نہیں بلکہ اس میں سے متعدد شعر خارج ہوئے ۔

عمدۂ منتخبہ ، عیار الشعرا اور دیگر قدیم ماخذ سے عرشی صاحب نے جو اشعار جمع کیے ہیں ۔ ان کا جائزہ بے موقع نہ ہو گا ۔ ذیل میں اس کی تفصیل بقید صفحات نسخۂ عرشی درج ہے (ہم نے پتنگ بازی سے متعلق اشعار کا صرف عنوان دے دیا ہے اشعار کے لیے اصل مطبوعہ نسخے سے رجوع کیا جائے) دیوان معروف سے اخذ شدہ غزل کے ساتھ شعر بھی اختصار کی خاطر حذف کرکے صرف مطلع درج کیا جا رہا ہے ۔ باقی اشعار پورے کے پورے نقل ہوئے ہیں :

پتنگ بازی پر مثنوی (نسخۂ عرشی صفحۂ ۲۶۶ پر اشعار ملاحظہ ہوں) کل اشعار ۱۱

جگر سے ٹوٹے ہوئے مو کی ہے سناں پیدا
دہان زخم سے، آخر ہوئی زباں پیدا
(عمدۂ منتخبہ) عرشی صفحہ ۲۹۳

یاد آیا وہ جو کہتا کہ نہیں راہ غلط
کی تصور نے بصحرائے ہوس راہ غلط
(عمدہ) عرشی صفحہ ۲۹۵

محفل شمع عذراں میں جو آ جاتا ہوں
شمعساں میں تہ داماں صبا جاتا ہوں
ہوئی ہے جادۂ رہ رشتۂ گوہر ہر گام
جس گزر گاہ میں میں آبلہ پا جاتا ہوں
سرگراں مجھ سے سبکرو کے نہ رھنے سے رہو
کہ بیک جنبش لب مثل صدا جاتا ہوں

(عمدہ) عرشی صفحہ ۲۹۷

دیکھتا ہوں اسے تھی جس کی تمنا مجھ کو
آج بیداری میں ہے خواب زلیخا مجھ کو

(عمدہ) عرشی ۳۰۱

شمشیر صاف یار جو زہراب دادہ ہو
وہ خط سبز ہے کہ برخسار سادہ ہو

(عمدہ) عرشی ۳۰۱

ھنستے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ناتواں مجھے
یہ رنگ زرد ہے چمن زعفراں مجھے

(عمدہ) عرشی ۳۰۴

دیکھ وہ برق تبسم بس کہ دل بے تاب ہے
دیدۂ گریاں مرا فوارۂ سیماب ہے
کھول کر دروازۂ میخانہ بولا مے فروش
اب شکست توبہ میخواروں کو فتح الباب ہے

(عمدہ) عرشی ۳۰۴

اک گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے
رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے

پروانے کا نہ غم ہو تو پھر کس لیے اسد
ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے
(عمدہ) عرشی ص ۳۰۴

ماہ نو ہوں کہ فلک عجز سکھاتا ہے مجھے
عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سلاتا ہے مجھے
(عمدہ) عرشی ۳۰۵

زخم دل تم نے دکھایا ہے کے جی جانے ہے
ایسے ہنستے کو رلایا ہے کہ جی جانے ہے
(عیار الشعرا) عرشی ۳۰۵

صبا لگا وہ طمانچہ طرف سے بلبل کی
کہ روے غنچہ گل سوے آشیاں پھر جائے
(عیار الشعرا) عرشی ۳۰۵

اپنا احوال دل زار کہوں یا نہ کہوں
ہے حیا مانع اظہار کہوں یا نہ کہوں
(گل ے شعر)

(بحوالہ دیوان معروف) عرشی صفحہ ۲۹۸

طرز بیدل میں ریختہ کہنا اسداللہ خاں قیامت ہے

(بحوالہ عود ہندی صفحہ ۱۵۹) عرشی ۳۰۵

ان اشعار میں سے پتنگ بازی کے سلسلے کے اشعار حالی کی یادگار غالب سے ماخوذ ہیں اور یقیناً غالب کا ابتدائی کلام ہے جس کی کوئی نقل ابتدائی دور کے بعد غالب کی دسترس میں نہیں تھی اور نو مشقی کا کلام ہونے کی وجہ سے ان کے لیے قابل اعتنا بھی نہیں تھا ۔ عود ہندی کے حوالے کا مقطع زبان خال سے اپنی قدامت

کی گواہی دے رہا ہے ۔ دیوان معروف کے حوالے سے درج شدہ کلام بھی ۱۸۲۶ع سے قبل کا ہے ۔ کیوں کہ اس سال معروف نے انتقال کیا ۔ ظاہر ہے یہ غزل ان کی زندگی میں کہی گئی ۔ مجھے معروف کے دیوان والی غزل کے بارے میں شبہہ ہے کہ اسے ۱۸۲۶ع سے قبل کی تسلیم کرنا تو درست لیکن ۱۸۲۱ع سے قبل کی کیوں سمجھی جائے ، اسے کیوں نہ ۱۸۲۱ع اور ۱۸۲۶ع کے مابین کی فرض کر لیں ۔ بہر حال اس کا زمانۂ تحریر مشکوک ہے ۔ اس لحاظ سے صرف بارہ شعر یقینی طور پر ۱۸۲۱ع سے قبل کے معلوم ہوتے ہیں ۔ عمدۂ منتخبہ اور ذکا کے تذکرے کے اشعار میری دانست میں کسی طرح بھی ۱۸۲۱ع سے قبل کے شمار نہیں کیے جا سکتے ۔ اس کے لیے ہمیں ان تذکروں کے بارے میں کچھ تفصیلات دیکھنی پڑیں گی ۔ ان میں درج شدہ ترجمۂ غالب رہنمائی کرتا ہے ۔

عمدۂ منتخبہ میں غالب کا حال اسد تخلص کے تحت یوں درج ہے :

"اسد تخلص ، اسداللہ خان عرف مرزا نوشتہ ۔ اصلش از سمرقند ، مولدش مستقرالخلافہ اکبر آباد ۔ جوان قابل و یارباش و دردمند ۔ همیشه به خوش معاشی بسر بوده ۔ ذوق ریختہ گوئی در خاطر متمکن ، [خو کردۂ ؟] غم‌هاے عشق مجاز ، تربیت یافتہ غم کدۂ نیاز ۔ در فن سخن سنجی متتبع محاورات مرزا عبدالقادر بیدل علیہ‌الرحمة و ریختہ در محاورات فارسی موزون می کند ۔ بالجملہ موجد طرز خود است و با راقم رابطۂ یک جہتی مستحکم دارد ۔ اکثر اشعارش از زمین سنگلاخ و مضامین نازک موزون گشتہ ۔ رویۂ خیال بندی بیش از بیش پیش نہاد خاطر دارد"۲۵

اس اقتباس میں مندرجہ ذیل امور قابل غور ہیں :

(۱) جب یہ حالات لکھے گئے غالب جوان تھا ۔

(۲) اس کی عشق و عاشقی اور خوش معاشی (مالی آسودگی) کا دور ہے ۔

(۳) ابھی اس کے مزاج پر بے دلیت حاوی ہے ۔

(۴) ابھی اس کے ہاں ریختہ گوئی کا ذوق ہے اور اس کی شہرت بطور ریختہ گو ہے (غالب کی فارسی شاعری کا ذکر سرور نے نہیں کیا) ۔ غالب کی فارسی شاعری ۱۸۲۲ع (۱۲۳۸ھ) کے لگ بھگ باقاعدہ شروع ہو چکی تھی ، سرور نے غالب کا حال اسی زمانے میں لکھا ہے جب ابھی غالب کی شہرت بطور فارسی شاعر اور بتخلص غالب نہیں بلکہ بتخلص اسد تھی ۔

سرور دھلی کے باشندے تھے[۳۶] اس لیے قرینہ یہ ہے کہ اسد کا حال اس کے قیام دھلی کے زمانے ہی میں مرقوم ہوا ہو ۔

جناب ایس ایم اکرام عمدۂ منتخبہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس میں غالب کو اکبرآباد کا ساکن بتایا گیا ہے[۳۷] شاید اسی شبہے میں عرشی صاحب نے اس میں کے درج شدہ کلام کو ۱۸۲۱ع سے قبل کا تصور کر لیا ہے جب غالب ابھی آگرے میں قیام پذیر تھے۔ شیخ صاحب تذکرے کی عبارت سے دھوکا کھا گئے ہیں ۔ یہاں اسد کو ساکن اکبرآباد نہیں بلکہ مستقرالخلافہ اکبر آباد کو اس کا مولد بتایا گیا ہے ۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اقتباس بالا میں اسد کو نوجوان نہیں صرف جوان کہا گیا ہے ۔ مرزا اسد اللہ خاں ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ع میں پیدا ہوئے ان کا دلی میں آنا جانا سات برس کی عمر سے (۱۲۱۹ھ) ہوگیا تھا[۳۸]۔ قیام دہلی ۱۲۲۸ھ/۱۸۱۲ع کے

قریب متصور ہے[۴۹] اس وقت غالب کی عمر ۱۶ برس کے لگ بھگ ہوتی ہے جو نوجوانی کا دور ہے ۔ غالب کی عیش و عشرت کی زندگی اور عشق و عاشقی کا زمانہ قیام دلی کا یہی دور ہے۔ غالب کا مشہور مرثیہ مندرجہ ذیل مقطع رکھتا تھا جو نسخۂ شیرانی میں ہے :

گر مضیبت تھی تو غربت میں اٹھا لیتے اسد
میری دلی میں ہی ہونی تھی یہ خواری ہائے ہائے[۵۰]

نسخۂ حمیدیہ میں بھی یہ مقطع اسی شکل میں ہے ۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ سرور نے اسداللہ خاں اسد (غالب) کے حالات اس کے قیام دلی کے زمانے میں لکھے ہوں گے ۔

تحریر ترجمہ کے وقت کلام غالب میں رنگ بے دل ۱۸۲۱ء تک پوری طرح راسخ ہے ۔نسخۂ شیرانی (مابین ۱۸۲۱ع و ۱۸۲۶ع) کی تحریر کے وقت انہوں نے رنگ بے دل کی غزلیں کلام سے ایک معقول تعداد میں خارج کی ہیں ۔ اس سے قبل اس کے مجموعۂ کلام میں بے دل کا رنگ برقرار و بحال ہے ۔

غالب کی مالی آسودگی کا زمانہ ۱۸۱۲ع سے ۱۸۲۶ع تک ہے۔ ۱۸۲۶ع میں ان کی پنشن کا قضیہ شروع ہوا[۵۱] اور وہ مالی پریشانیوں میں محصور ہوگئے۔ اس لیے ان کے حالات کی تحریر کا زمانہ ۱۸۲۶ع سے قبل شمار کرنا موزوں ہو گا ۔

اس مرحلے پر عمدۂ منتخبہ کی تحریر کا زمانہ بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے ۔ نسخۂ لندن کا ترقیمہ یہ ہے :

"الحمداللہ کہ بفضل ایزد متعال این نسخہ نہم محرم الحرام ۱۲۲۴ھ موافق سنۂ جلوس مبارک بادشاہ جم جاہ......ظل اللہ حضرت محمد اکبر بادشاہ غازی خلداللہ ملکہ و سلطانہ صورت اختتام پذیرفت"[۵۲]

اس سے قلمی نسخے کے اختتام کا سنہ ۱۲۲۴ھ معلوم ہوتا ہے اکبر شاہ کی تخت نشینی ۱۲۲۴ھ میں اور وفات ۱۲۵۲ھ میں ہوئی ۔ بظاہر تخت نشینی کے سنہ کے بارے میں عبارت میں کچھ مغالطہ ہے ۔

دیباچہ نگار (ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی) نے تاریخ اختتام کی تصدیق دیگر ذرائع سے بھی کی ہے ۔ شاید ترقیمے میں کاتب نے کسی اولیں قلمی نسخے سے نقل کرتے ہوئے "جلوس اکبر شاہ" کا ٹکڑا علی حالہ نقل کر لیا ہے اور سنہ اپنی کتابت کا درج کیا ہے ۔ اس تناقض کے علاوہ یہ بات بھی اہم ہے کہ سرور نے قاسم کے ترجمے میں بصراحت بیان کیا ہے کہ جب قاسم کو تذکرہ لکھنے کا خیال ہوا تو اس نے سرور کا تذکرہ ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء میں اپنے گھر لے جا کر اس سے استفادہ کیا اور اپنا تذکرہ مکمل کیا[۵۳] ۔ قاسم کا تذکرہ مجموعۂ نغز ۱۲۲۱ھ میں مکمل ہوا ۔ عمدۂ منتخبہ میں اسد تخلص کے تین شاعروں کا ذکر ہے میرامانی اسد (صفحہ ۵۳) رائے کیرت سنگھ اسد قوم کھتری (صفحہ ۹۷) اور اسد اللہ خاں اسد (غالب) (صفحہ ۱۱۶) ۔ مجموعۂ نغز میں اسد تخلص کے تحت یہ عبارت مرقوم ہے :

"تخلص دو کس بمن رسید۔ذکر یکے ازیشان بہ تکملہ اوفق پنداشت ۔ و یکے را در این جا نوشتن مناسب انگاشت و آن میرامانی مرحوم است"[۵۴]

جلد دوم میں لکھا ہے :

"تخلص رائے کیرت سنگھ کھتری........"[۵۵]

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ۱۲۱۹ھ میں جب یہ تذکرہ قاسم لے کر گئے تو اس میں اسداللہ اسد (غالب) کا حال شامل نہیں تھا ۔

غالب کا سنۂ پیدائش ۱۲۱۲ھ ہے ۱۲۱۹ھ میں ان کی عمر صرف سات برس تھی۔ ظاہر ہے اس وقت غالب کے حالات کی شمولیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ۱۲۲۱ھ تک (تکمیل مجموعۂ نغز) تک بھی ان کی شہرت نہیں ہو گی۔ ۹ محرم ۱۲۲۴ھ (تکمیل عمدۂ منتخبہ) میں اگر اسداللہ خاں کے حالات داخل تذکرہ ہوں تو اس وقت بھی اس کی عمر نوجوانی کی منزل میں اور ۱۲ برس سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ یہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ ان کا مستقل قیام دہلی ۱۲۲۸ھ/۱۸۱۲ع کے قریب ہے اور یہ کہ سرور نے ان کا حال ایسے زمانے میں لکھا جب وہ مالی آسودگی اور عیاشی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور فارسی شاعری کا عروج اور غالب تخلص کا استعمال ابھی اتنا شہرت پذیر نہ ہوا تھا۔ ان دلائل کی روشنی میں میرا قیاس یہ ہے کہ غالب کا حال ۱۸۲۱ع/۱۲۳۷ھ (سنۂ کتابت نسخۂ بھوپال) اور ۱۸۲۶ع/۱۲۴۲ھ کے مابین داخل تذکرہ ہوا ہو گا۔

عمدۂ منتخبہ کے درج شدہ اشعار بہ استثناء دو غزلوں کے جو نسخۂ امروہہ میں ہیں، اغلب یہ ہے نسخۂ حمیدیہ کی کتابت کے بعد کسی وقت لکھے گئے ہوں[۵۶]۔

اب خوب چند ذکا کے عیارالشعرا کو لیا جاتا ہے۔ اس میں غالب کا حال غالب تخلص کے تحت بدین الفاظ مرقوم ہے:

"مرزا اسداللہ خاں عرف مرزا نوشہ المتخلص بہ غالب ولد مرزا عبداللہ خاں عرف مرزا دولہ نبیرہ مرزا غلام حسین کمیدان ساکن بلدۂ اکبرآباد، شاگرد مولوی محمد معظم، شاعر فارسی و ہندی است"[۵۷]۔

اس تذکرے کے بارے میں بھی اکرام صاحب کا ارشاد ہے

کہ اس میں غالب کو ساکن اکبرآباد۔ کہا گیا ہے[۵۸] عبارت مرقومہ الصدر میں اکرام صاحب کو **punctuation** میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ تذکرہ نگار نے جیسا کہ جملے کی ساخت سے واضح ہے جس طرح غالب کے والد کا عرف مرزا دولہ دیا ہے اور اس کے بعد 'کوما' شمار ہوتا ہے اسی طرح مرزا غلام حسین محمد کمیدان کو ساکن بلدۂ اکبر آباد کہا ہے اور اس کے بعد 'کوما' (coma) لگایا ہوگا۔ غالب نے فارسی شاعری کا باقاعدہ آغاز ۱۸۲۲ء/۱۲۳۸ھ کے قریب کیا۔ اسی زمانے میں غالب تخلص فارسی میں بالالتزام اور اردو میں اکثر کیا گیا۔ ان کا حال داخل تذکرہ اس وقت کیا گیا جب وہ اسد سے زیادہ غالب کے طور پر مشہور ہوئے تھے۔ نیز ان کی اردو شاعری کے ساتھ ساتھ فارسی شاعری کی قدر ہونے لگی تھی (شاعر فارسی و ہندی)۔ اس ترجمے کی تحریر کا زمانہ یقیناً ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۲ع کے بہت بعد کا ہے۔ تذکرۂ ذکا کا آغاز انڈیا آفس کے نسخے کے مطابق ۱۲۰۳ھ میں، مخطوطہ علی گڑھ کے مطابق ۱۲۱۳ھ میں ہوا[۵۹] لیکن ترمیم و اضافے کا عمل برس ہا برس تک جاری رہا۔ بقول ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی اس میں آخری تاریخ جس کا ذکر ملتا ہے ۱۲۴۷ھ ہے[۶۰] اس لیے عجب نہیں اگر غالب کا حال بھی ۱۲۴۷ھ کے قریب داخل تذکرہ ہوا ہو۔ اس استدلال سے یہ نتیجہ بخوبی نکلتا ہے کہ عیارالشعراء میں درج شدہ زائد اشعار نسخۂ بھوپال کے بعد لکھے گئے ہوں۔

ہماری رائے میں نسخۂ بھوپال سے خارج شدہ کلام کی مقدار قلیل ہے[۶۱]۔ اس لیے نسخہ بھوپال کو ۱۲۳۷ھ تک کے کم و بیش پورے کلام کا مجموعہ خیال کرنا بے جا نہ ہو گا اور "متعدد" اشعار کے اخراج کا دعویٰ قابل قبول نہیں۔

نسخۂ بھوپال کے بارے میں عرشی صاحب کے دیگر بیانات

کا ملخص یہ ہے کہ نسخۂ بھوپال کی تاریخ کتابت (صفر ۱۲۳۷ھ/ اکتوبر ۱۸۲۱ع) کے بعد مرزا نے اپنے کلام میں تہذیب و تنقیح کا عمل شروع کیا (اس بارے میں قاضی صاحب کی رائے درج کی جا چکی ہے جس میں اس امکان کا اظہار ہے کہ کچھ اضافات و اصلاحات ۵ صفر ۱۲۳۷ھ سے قبل کی ہوں) بقول عرشی نسخۂ بھوپال کی ترمیمیں اور اصلاحیں حاشیے اور بین‌السطور اس قیاس کی تائید کرتے ہیں اور یہ عمل شوال ۱۲۴۲ھ/ اپریل ۱۸۲۶ع تک (یعنی سفر کلکتہ پر روانہ ہونے تک) جاری رہا۔

جناب عرشی کے ارشاد کے دوسرے حصے سے اتفاق مشکل ہے حک و اصلاح اور اضافوں کا یہ عمل سفر کلکتہ کے آغاز تک جاری رہا ہو مجھے اس میں کلام ہے—البتہ ان کا یہ قیاس درست ہے کہ نسخۂ شیرانی بھوپالی نسخے کا مبیضہ ہے۔ اس کے متن کے مندرجات بالکل بھوپالی نسخے کی ترمیموں کے مطابق ہیں۔ بھوپالی نسخے کے حاشیوں کی غزلیں نسخۂ شیرانی کے متن میں درج ہیں۔

ابھی یہ عرض کیا گیا ہے کہ عرشی صاحب کا یہ خیال کہ نسخۂ بھوپال میں حک و اصلاح اور اضافوں کا عمل سفر کلکتہ تک جاری رہا درست نہیں۔ اس کے لیے نسخۂ بھوپال اور نسخۂ شیرانی کا تقابلی مطالعہ ضروری ہے۔

(۴)

نسخۂ شیرانی: نسخۂ شیرانی کا موجودہ شکل میں آغاز غزلوں سے ہوتا ہے۔ تین مقامات پر نسخہ ناقص ہے۔ ورق ۱۶ ب اور ورق ۱۷ الف کے مابین، ورق ۲۶ ب اور ورق ۲۷ الف کے درمیان اور ۱۰۶ ب ورق ۱۰۷ الف کے درمیان اوراق افتادہ ہیں۔ عرشی صاحب اور قاضی صاحب کا قیاس ہے کہ ورق ۱۶ ب کے بعد

ایک ورق اور ورق ۲۶ ب کے بعد ایک ورق نہیں، لیکن آخری منقبت سے قبل کتنے اوراق غائب ہیں اس کا اندازہ مشکل ہے۔ میرا قیاس یہ ہے۔ کہ آخری منقبت جو اول و آخر سے ناقص ہے دراصل شروع نسخہ میں اور مکمل صورت میں درج تھی، عین ممکن ہے کہ نسخۂ بھوپال کی کل منقبتیں اس میں شامل ہوں۔ اس کا قرینہ یوں ہے کہ نسخۂ بھوپال مکمل صورت میں اسی ترتیب میں ہے[۶۲] کہ شروع میں "فاتحہ" فارسی ہے،"پھر قصیدۂ حیدری تمہید بہار مغفرت" اور اس کے بعد "قصیدہ فی المنقبت" (قوافی دین، یقین) اور پھر قصیدۂ فی المنقبت (قوافی پاسبانی ' بے زبانی) ' اس کے بعد غزلیات اور آخر میں رباعیات ہیں۔ نسخۂ شیرانی کی ترتیب بھی بظاہر یہی ہونی چاہیے تھی۔ اس قیاس کو اس سے بھی تقویت ملتی ہے کہ یہ زمانہ غالب کے مذہبی رحجانات کی تندی کا ہے ایسے میں منقبت کا آخر میں درج ہونا جب کہ دونوں قلمی نسخے کم و بیش معاصر ہوں ' کچھ کھٹکتا ہے۔ میرا گمان یہ ہے کہ منقبت آغاز میں تھی اور غزلیں بعد میں۔ جلد بندی میں کسی صاحب نے غزلوں کی خوشنما لوح کے پیش نظر اسے بے ترتیب کر دیا ہے۔ موجودہ ناقص حالت میں اس نسخے کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں جا بجا غالب کے قلم سے متن میں ترمیم و اصلاح کے نشان موجود ہیں۔ حاشیے پر ایک غزل خود غالب کے ھاتھ کی لکھی ہوئی ہے اس کے علاوہ بھی کچھ غزلیں حاشیوں پر درج ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے :

۲ (الف) حاشیے پر ایک شعر :

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

یہ اضافہ بقول عرشی زمانۂ حال کے کسی شخص کے ھاتھ کا ہے

۳ (ب) حاشیے کی پیشانی پر "از باندہ فرستادند"

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا

اس مطلع کے بعد اس غزل کے آٹھ شعر اس صفحے پر اور ورق ۳ الف پر باقی چار شعر (کل ۱۲ شعر) - یہ تحریر اسی شخص کی ہے جو اس نسخے کا کاتب ہے -

۹ (الف) حاشیے پر مندرجہ ذیل شعر بخط غالب درج ہیں :

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا (کل ۱۳ شعر)

۳۳ (الف) حاشیے پر عنوان "از بانده رسید"

آبرو کیا خاک اس گل کی جو گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگ پیراہن جو دامن میں نہیں

اس غزل کے گیارہ شعر ہیں اور یہ نسخے کے کاتب کے ھاتھ کی لکھی ہوئی ہے - اس غزل کے نیچے حاشیے پر ایک اور غزل ہے جو کاتب نسخہ کے قلم سے ہے :

ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

اس صفحے پر آٹھ شعر ہیں اور غزل کے باقی تین شعر دوسرے ورق (۳۳ ب) پر حاشیے میں کاتب نسخہ کے قلم سے مرقوم ہیں -

۳۳ - ب پر اسی غزل کے بعد ایک دوسری غزل ہے :

نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

کاتب نسخہ کے قلم سے -

۵۶ (الف) غزل مع قطعہ بند اشعار حاشیے پر :

واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو
صد رہ آہنگ زمیں بوس قدم ہے ہم کو

دس شعر غزل کے اور اس کے بعد مندرجہ ذیل قطعہ بند اشعار۔ یہ غزل اور قطعہ بند بھی کاتب نسخہ کے ہاتھ سے ہے۔ قطعہ بند اشعار یہ ہیں :

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا غالب
ہوس سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
طاقت رنج سفر ہی نہیں پاتے اتنی
ہجر یاران وطن کا بھی الم ہے ہم کو
لائی ہے معتمد الدولہ بہادر کی اُمید
جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو

۶۱ (الف) حاشیے پر یہ غزل بخط کاتب درج ہے :

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے (کل ۱۳ شعر)

اس صفحے کے حاشیے پر دوسری غزل شروع ہوتی ہے :

کب سنے ہے وہ کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

ایک شعر اس صفحے پر اور باقی اشعار ورق ۶۱ ب کے حاشیے پر درج ہیں۔ غزل کے کل ۹ شعر ہیں۔ حاشیے میں درج شدہ غزلوں میں سے کوئی شعر بھی نسخۂ بھوپال میں درج نہیں ہے۔ ان اشعار میں سے دو جگہ ''از باندہ فرستادند'' اور ''از باندہ رسیدہ'' لکھا ہے

اور ایک غزل میں لکھنؤ کا صریحی ذکر ہے۔ یہ غزلیں جو حاشیے پر مندرج ہیں نسخۂ بھوپال سے غیر حاضر ہیں، یعنی نہ تو اس کے متن میں درج ہیں نہ حاشیوں پر اور نہ آخر کے سادہ اوراق پر۔ اس سے دو منطقی نتیجے نکلتے ہیں :

(الف) نسخۂ بھوپال جس کا سنہ کتابت ۵ صفر ۱۲۳۷ھ ہے نسخۂ شیرانی سے اقدم ہے (اور تمام محقق اس نتیجے سے متفق ہیں)۔

(ب) حاشیے کی مذکورہ غزلیں اس وقت کہی گئی ہیں جب نسخۂ بھوپال غالب کی دسترس میں نہیں رہا تھا۔

نسخۂ بھوپال (میرے سامنے اس کی مطبوعہ صورت نسخۂ حمیدیہ، نسخۂ عرشی کے حواشی اور نسخۂ حمیدیہ کی لاہوری اشاعت ہے) اور نسخۂ شیرانی کے باہمی مقابلے سے مجھے مندرجہ ذیل ایسی غزلیں ملی ہیں جو نسخۂ شیرانی کے متن میں موجود ہیں لیکن نسخۂ بھوپال سے غیر حاضر ہیں۔ ان غزلوں کے صرف مطلعے یہاں درج کیے جا رہے ہیں۔ و ھو ھذا :

۱۔ بے اعتدالیوں سے سبک سب ہیں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

۲۔ عجب نشاط سے جلاد کی چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سایہ سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

۳۔ جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو یارب اسے قسمت میں عدو کی

۴۔ فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابند نے نہیں ہے

۵- خود فروشی ہائے ہستی بسکہ جائے خندہ ہے
ہر شکست قیمت دل میں صدائے خندہ ہے

اس سے ایک تیسرا منطقی نتیجہ نکلتا ہے کہ :

(ج) جس وقت یہ غزلیں لکھی گئیں (جو نسخۂ شیرانی کے متن میں درج ہیں اور نسخۂ بھوپال کے متن اور حواشی اور آخر کے اضافات دونوں سے غیر حاضر ہیں) اس وقت تک نسخۂ بھوپال غالب کے ہاتھ سے نکل چکا تھا ، اس لیے یہ غزلیں اس میں جگہ نہ پا سکیں ۔

نسخۂ بھوپال کب تک غالب کی دسترس میں رہا ؟ اسے نسخہ شیرانی کی روشنی میں دیکھنے کی ضرورت ہے ۔

(۵)

گھوم پھر کر مسئلہ غالب کی ان غزلوں کے زمانۂ تحریر پر آ کر ٹھہرتا ہے ۔ اول ان غزلوں کو لیا جاتا ہے جو نسخۂ شیرانی کے حاشیوں پر درج ہیں ۔ ان غزلوں میں دو کی پیشانی پر "باندہ" درج ہے اور ایک میں وہ قطعہ ہے جو غالب نے اسی سفر میں لکھنؤ کے دوران قیام لکھا تھا ۔

غالب کے سفر کلکتہ کی غایت کیا تھی ؟ غالب جیسا کہ ان کا اپنا بیان ہے نسلاً ترک تھے ۔ ان کے دادا توقان بیگ عہد محمد شاہ میں اپنے وطن سمر قند سے ترک وطن کرکے لاہور میں آئے ۔ دلی میں ان کی آمد عہد شاہ عالم ثانی میں ہوئی ۔ ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں کی سرپرستی میں انہیں اچھی ملازمت مل گئی اور پہاسو کا پرگنہ ذات اور رسالے کی تنخواہ کے لیے مقرر ہوا[۶۳] ان کے بیٹے عبداللہ بیگ خاں کی شادی آگرے کے معزز گھرانے میں خواجہ غلام حسین

خاں کمیدان کی بیٹی سے ہوئی ۔ عبداللہ بیگ خان خانہ داماد کی حیثیت سے اکثر آگرے ہی میں رہے ۔ والد کے انتقال پر جب پھاسو کی جاگیر جاتی رہی تو تلاش معاش کے لیے عبداللہ بیگ کو پہلے لکھنؤ اور پھر حیدرآباد کا رخ کرنا پڑا ۔ آخر انھوں نے الور کی ٹھانی ۔ یہاں وہ ایک حادثے میں باغیوں کی سرکوبی کرتے ہوئے کام آئے ۔ عبداللہ بیگ کی اولاد میں کم از کم ایک لڑکی اور دو بیٹوں کا حال کسی حد تک معلوم ہے ۔ ان بیٹوں میں مرزا محمد اسداللہ بیگ خاں (جو بعد میں اسد اور غالب کہلائے) ۸ رجب ۱۲۱۲ھ ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو اپنے ننھال آگرے میں پیدا ہوئے ۔ ان کے والد کے انتقال کے وقت ان کی عمر پانچ برس کی تھی ۔ باپ کے انتقال کے بعد ان کی تربیت ان کے چچا نصراللہ بیگ کے سپرد ہوئی۔ نصراللہ بیگ خاں مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کے صوبہ دار بیان کیے جاتے ہیں[۶۴] ۔ نصراللہ بیگ کی شادی نواب احمد بخش خاں والی لوھارو کی ہمشیرہ سے ہوئی تھی ۔ یہ بے اولاد تھے۔ انھوں نے غالب کی پرورش اپنے ذمے لی ۔ لارڈ لیک نے مرہٹوں کو شکست دے کر اکبر آباد پر قبضہ کیا تو نصراللہ بیگ کا عہدہ جاتا رہا ۔ سسرال کے اثر سے نصراللہ بیگ کو انگریزی فوج میں چار سو سوار کے رسالے کا افسر مقرر کر لیا گیا ۔ ان کی ذات کے لیے سترہ سو روپے ماھانہ اور رسالے کی تنخواہ کے لیے نواح آگرہ کے دو پرگنے سونگھ اور سونسہ بطور جاگیر مل گئے ۔ سال بھر کے بعد نصراللہ بیگ خاں ۱۸۰۶ء میں ایک معرکے میں مارے گیے اور غالب اپنے ننھال آگرے میں غلام حسین خاں کمیدان کی سرپرستی میں آگئے۔ نواب احمد بخش کی سفارش سے انگریزوں کی طرف سے غالب اور اس کے بہن بھائیوں کے لیے پینشن کا انتظام ہو گیا ۔ نصراللہ بیگ کے پرگنے جاتے رہے ان کا رسالہ بھی توڑ دیا گیا ۔ اس دستے کے پچاس سوار ریاست الور

کے سپرد ہوئے۔ رسالے کی ان باقیات، نیز نصراللہ بیگ کے بھتیجوں بھتیجی کے لیے ۴ مئی ۱۸۰۶ء کو پنشن کا حکم ہوا۔ قرار یہ پایا کہ نواب احمد بخش خاں اپنی جاگیر کے سلسلے میں پچیس ہزار کی رقم جو سرکار انگریزی کو ادا کرتے تھے وہ اس شرط پر معاف کہ آئندہ پندرہ ہزار روپے سالانہ وہ دستے کی پرداخت پر صرف کریں اور باقی دس ہزار کی رقم نصراللہ بیگ مرحوم کے خاندان میں بطور پنشن دی جائے۔ ۷ جون ۱۸۰۶ء کو نواب احمد بخش خاں نے اس فیصلے میں ترمیم کرا لی اور فیصلہ ہوا کہ نصراللہ بیگ کے متعلقین کو پانچ ہزار روپے سالانہ دیے جائیں' جس میں خواجہ حاجی کو دو ہزار سالانہ، مرزا نصراللہ بیگ کی والدہ اور تین بہنوں کو ڈیڑھ ہزار روپیہ سالانہ، غالب اور ان کے بھائی اور بہن کو ڈیڑھ ہزار روپے سالانہ دیے جائیں۔ اسداللہ بیگ خاں کی پرورش ان کے ننہال میں ہوتی رہی۔ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ/۹ اگست ۱۸۱۰ء میں ان کی شادی اپنے چچا کے سسرال میں نواب احمد بخش خاں کے چھوٹے بھائی الٰہی بخش معروف کی لڑکی سے ہوگئی۔ اسداللہ بیگ خاں اس شادی کے دو تین برس بعد (تقریباً ۱۲۲۸ھ میں) مستقل طور پر دلی میں آ گئے۔ فراغت کی زندگی بسر ہونے لگی۔ نواب احمد بخش خاں مالی مدد کرتے رہے اور پنشن کا روپیہ بھی بہ آسانی ملتا رہا۔ تاآنکہ ۱۸۲۶ء میں نواب احمد بخش نے اپنی زندگی ہی میں اپنی جائداد کو اپنی اولاد میں تقسیم کر دیا اور خود گوشہ نشین ہو گئے۔ جائیداد کی تقسیم کا معاہدہ سرکار انگریزی سے ۱۸۲۲ء ہوا اور عملاً درآمد ۱۸۲۶ء میں۔

۱۸۲۶ھ میں غالب کی پنشن نواب کے بڑے بیٹے نواب شمس‌الدین احمد خاں سے متعلق ہوئی۔ نواب شمس‌الدین احمد خاں نواب کی میواتی بیوی سے تھے اور نواب ضیاءالدین نیر و رخشاں اور

نواب امین الدین خان دوسری بیوی سے۔ اسداللہ بیگ نواب شمس الدین کے مخالف اور رخشاں اور امین الدین کے حامی تھے، لیکن ان کی پنشن کا تعلق نواب شمس الدین سے ہوا۔ نواب شمس الدین نے پنشن کی ترسیل میں طرح طرح کے روڑے اٹکانے شروع کیے اور بالآخر اپریل ۱۸۳۱ء میں پنشن بالکل بند کر دی (نواب نے ۱۸۳۵ء میں پھانسی پائی غالب کو بقایاجات ۱۸۳۷ء کے قریب جا کر ملے) نواب احمد بخش جب تک خود مختار معاملات تھے، وہ اسداللہ بیگ کی پنشن[۶۵] کے علاوہ بھی کچھ نہ کچھ مدد کرتے رہتے تھے اب ان کی دست برداری کے بعد اسداللہ بیگ مالی طور پر پریشان اور مقروض ہوتے چلے گیے - ۱۸۲۶ء میں نواب احمد بخش کی دست برداری ہی کے زمانے میں ایک دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ خواجہ حاجی انتقال کر گئے - اسداللہ بیگ خواجہ حاجی کو پنشن کا حق دار نہیں جانتے تھے لیکن نواب احمد بخش کی وجہ سے خاموش تھے، ان کا خیال تھا خواجہ حاجی کے بعد اس کے حصے کی پنشن مجھے منتقل ہو جائے گی، لیکن جب خواجہ حاجی کے انتقال پر یہ رقم ان کی اولاد کو ملنے لگی تو غالب اس معاملے میں قانونی چارہ جوئی پر مجبور ہو گئے اور اس مقصد کے لیے انھوں نے کلکتے کا سفر اختیار کیا[۶۶] -

اسداللہ بیگ خان غالب ۱۲۴۲ھ کی عید شوال کے بعد جون ۱۸۲۷ء کے قریب[۶۷] چلے، ذی قعدہ ۱۲۴۲ھ کو لکھنؤ میں تھے[۶۸] ۲۶ - ذی قعدہ کو لکھنؤ سے چلے، ۲۹ ذی قعدہ کو کانپور اور پھر باندہ جا پہنچے[۶۹] باندے سے الہ آباد، بنارس اور پٹنہ سے کلکتہ - کلکتے میں ان کا ورود بقول مہر اواخر ۱۸۲۸ء میں ہوا[۷۰] - لیکن مالک رام اس سے متفق نہیں - ان کی تحقیق کے مطابق غالب غالباً اگست ۱۸۲۶ء میں دلی سے نکلے - لکھنؤ کا قیام کم

از کم گیارہ ماہ رہا[۱] اور کلکتے میں ان کا ورود ۱۹ فروری ۱۸۲۸ع / ۴ شعبان ۱۲۴۳ھ کو ہوا [۲] کلکتے میں ڈیڑھ برس سے زیادہ عرصہ رہے۔ وہاں انہیں معلوم ہوا کہ پنشن کے لیے اول مقدمہ دلی میں ہونا چاہیے تھا۔ انہوں نے اس کے لیے کلکتے ہی میں بیٹھے بیٹھے انتظام کیا لیکن پھر خود واپس آنے کی ٹھانی۔ غالب ربیع الاول ۱۲۴۵ھ/ ستمبر ۱۸۲۹ع تک کلکتے میں قیام پذیر رہے[۳] ۲۔ جمادی الثانی ۱۲۴۵ھ/۲۹-۱۸۳۰ع کو دلی میں واپس پہنچ گئے۔ غالب کا سفر کلکتہ اور اس دوران کے اردو کے کلام کے بارے میں مندرجہ ذیل باتیں قابل لحاظ ہیں :

(۱) غالب اگست ۱۸۲۶ع سے قبل دلی سے نکلے تھے کیونکہ لکھنؤ میں انہوں نے کم از کم گیارہ ماہ قیام کیا۔ ۲۶ ذی قعدہ ۱۲۴۲ھ/۲۷ جون کو لکھنؤ سے باندے کی طرف روانہ ہوئے۔ جب غالب لکھنؤ پہنچے یہ غازی الدین حیدر کا دور حکومت تھا ان کے وزیر معتمدالدولہ آغا میر تھے۔ مرزا کی ان کی ملاقات کی تدبیر کی گئی لیکن یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ غالب کو توقع تھی لکھنؤ میں قدردانی سے ان کے کلکتے کے سفر اور دیگر اخراجات پورے ہو جائیں گے لیکن مالی اعتبار سے قیام لکھنؤ بے نتیجہ ثابت ہوا[۴] وہ اب رہ گرائے کلکتہ ہوئے۔ آغا میر سے ناامیدی کا واقعہ ان کے قیام لکھنؤ کے آخری زمانے میں متصور ہو گا یعنی ذی قعدہ ۱۲۴۲ھ/جون ۱۸۲۷ع کے گرد و پیش؛ کیونکہ اس تلخ تجربے کے بعد لکھنؤ میں ٹھہرنے کا کوئی عقلی جواز نہیں ہے۔ اس واقعے کے بارے میں اشعار جو حاشیۂ نسخۂ شیرانی پر ہیں ، وہ یہ ہیں :

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا غالب
ہوس سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
طاقت رنج سفر ہی نہیں پاتے اتنی
ھجر یاران وطن کا بھی الم ہے ہم کو
لائی ہے معتمدالدولہ بہادر کی امید
جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو

یہ اشعار متداول دیوان میں مندرجہ ذیل صورت میں ہیں :

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی
ہوس سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
مقطع سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزم سیر نجف و طوف حرم ہے ھم کو
لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب
جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو

نسخۂ شیرانی میں اشعار کی پہلی صورت ہے، دوسری صورت نہیں ہے۔

یہ دوسری صورت دو باتوں کے لیے توجہ طلب ہے :

(الف) مقطع سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزم سیر نجف و طوف حرم ہے ھم کو

(ب) لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب
جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو

غالب کو اپنے معاملات سے مایوسی کے بعد ملک چھوڑ کر چلے جانے کا خیال ہو گیا۔ میرا قیاس یہ ہے کہ مایوسی کا یہ احساس ان پر لکھنؤ سے باندہ جانے کے بعد باندے اور کلکتے کے

راستے میں غالب ہوا ہے - "لے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب"
یہ صریحاً کلکتے جانے اور مقدسے کے لیے تگ و دو کی طرف
اشارہ ہے - نسخۂ شیرانی میں اشعار کی اس تغیر یافتہ صورت کی
غیر موجودگی سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ یا تو اس نسخے کا
کاتب اس نئی صورت حال سے آگاہ نہیں ہے یا ان اشعار کی ترمیم
کے زمانے تک نسخۂ زیر نظر اس کی تحویل سے نکل چکا ہے - میری
رائے میں دوسرا امکان زیادہ مستعبد ہے -

نجف اشرف ، ایران اور یزد کی طرف نکل جانے کی خواہش
کا اظہار غالب نے دو تین جگہ اور بھی کیا ہے -

(الف) متفرقات غالب میں شیخ ناسخ کے نام ایک خط میں -

(ب) کلیات نثر فارسی میں میر اعظم علی مدرس مدرسہ
اکبرآباد کے نام خط میں -

(ج) کلیات نثر فارسی میں مولوی سراج الدین احمد کے نام
کے مکتوب میں -

(د) دیوان اردو متداول کے دیباچے میں -

اس مواد کی زمانی درجہ بندی ان کے خواهش کے اولیں اظہار
کی وضاحت کے لیے کافی ہے - شیخ ناسخ کے نام جو خط لکھا گیا ہے
اس کی اصل عبارت یہ ہے :

"نخست در معرض استفسار کمیٹ زر ڈگری و آنگاہ
برہنمونی سفر دکن ، نہفتہ مباد آنچہ کہ در عبودیت نامۂ پیشیں
ازیں عالم گفتہ شدہ بود سیرابی بیان داشت - ورنہ مرا کہ
با کشا کش تقاضا خو کردہ مدتی در مخمصۂ قرض بسر بردہ‌ام
ازین ہنگامہ بر دل بندے وگزندے نیست - و خود این مایہ
زر کہ از من بدارالقضا خواستہ می شود ، بدان نمی ارزد کہ

خاطرم را پراگندگی دهد ، چه از پنج هزار فزون تر نیست ۔ بهاے زیور و پیرایۂ شبستان بدین وفا تواند کرد ۔ آنچه که مرا می باید داد از چهل هزار افزون‌تر و از پنجاه هزار کم‌تر است ۔

حاشا که بدین وجه آرزوے امرا گرد دل گردد یا خود مناسب حالم بوده باشد ، مگر این قدر از دست بهم دهد تا به نشینم و مشت مشت بر مدعیان افشانم و خود را از ین بلا که دنیاش نامند ، بر کران کشیده ، قلندر گردم و گیتی را سراسر گردم ۔ این که لختے از عمر تلف نمودم ، در مدح شاه اوده سرودم ، آرائش بساط این تمنا بود و دریوزۂ دستگاه این ہوس ۔ چون کار ساخته نشد و زمزمۂ من بدلہاے سخت شاهان فرود نیامد ، روے گرداندم و برخود دریغ خوردم ۔ اکنون من کجا و سفر دکن کجا ۔ سی سال در رنگ و بو و مے و نے بسررفت ، اکنون دل را بدین ها گرایشے نمانده و داعیۂ (رهائی) از بند تن پدید آمده ، ہمه آن می خواہم که یک باره مرزبوم ایران را به پیمایم و آتشکده هاے شیراز را بربنگرم ۔ و اگر پاے عمر بسنگ نیاید ، فرجام کار به نجف اشرف برسم و مزار آن را که از کیش آبا بدر آورد و بے خود بخود کشید بنگرم ، مستانه جان دهم و سر ببالین فنا نہم...عزیمت سفر بے گسستن بند وام امضا پذیر نیست و چون این بند گسسته این سنگ از راه برخاسته شد ، حیف باشد که جز راه نجف پویم و واے بر من اگر جز وے جویم ۔ چندو لال زمرۂ ما را چه داند و هنجار ما را کے در یابد ۔ آنکه در پارسی قتیل را باوستادی گیرد ، غالب را چه می کند ۔ و آنکه در اردو نصیر را ستاید ، ناسخ را چه می کند ۔ و خود عمرش از هشتاد متجاوز است ،

باو می رسم او به جهنم می رسد"[۵۵] -

اس خط میں مہاراجا چندو لال اور شاہ نصیر کا ذکر ہے - شاہ کے چار دکنی سفر معلوم ہیں[۶] :

پہلا سفر : قبل از ۱۲۱۹ھ -- اس سلسلے میں نواب الٰہی بخش معروف کا منظوم خط موجود ہے -

دوسرا سفر : ۱۲۴۰ھ میں - اس وقت شاہ نصیر دربار چندو لال سے متوسل ہوئے - شاہ نصیر ۱۲۴۱ھ تک واپس دلی آ گئے تھے - غالب کا مذکورہ خط سفر کلکتہ کے بعد لکھا گیا ہے - ظاہر ہے اس سنہ کے توسل کی طرف غالب کا اشارہ نہیں ہے -

تیسرا سفر : ۱۲۴۱ھ اور ۱۲۴۷ھ کے درمیان کسی وقت ہوا - اس کی تفصیلات معلوم نہیں -

چوتھا سفر : ۱۲۴۷ھ میں ہوا اور اس قیام حیدرآباد میں ۱۲۵۴ھ میں شاہ نصیر کا انتقال ہو گیا - یہ زمانہ مہاراجا چندو لال شاداں کے انتہائی عروج اور بڑھاپے کا ہے -

چندو لال کا انتقال ۷۳ برس کی عمر میں سنہ ۱۲۶۱ھ میں ہوا - غالب نے یہاں چندو لال کے بڑھاپے کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے - ظاہر ہے چندو لال کی عمر کا اندازہ غلط ہے - بہر حال اتنا یقینی ہے کہ غالب نے دوسرے یا تیسرے سفر کے بعد ہی یہ خط ناسخ کے نام لکھا - خط میں جن واقعات کی طرف واضح اشارے ہیں غالب کی مالی مشکلات کا زمانۂ عروج ہے - یہ وہ دور ہے جب غالب قرض‌خواہوں کے

تقاضوں اور ڈگری کے خوف سے خانہ‌نشین ہے یعنی ۱۸۳۵ع - اس زمانے کا یا اس کے بعد شیخ ناسخ کے نام دوسرا خط کلیات نثر میں ہے - اقتباس یہ ہے :

"چار ماہ است کہ نامہ نگار بکنجے نشستہ و آمد شد بروے خویش و بیگانہ بستہ است - اگرچہ بزندان اندر نیم ، اماً خورد و خفت من بزندانیان ماند - آنچہ درین چند روز از رنج و آشوب دیدہ‌ام کافر باشم اگر ہیچ کافر بصد سالہ عقوبت جہنم یک نیمۂ ازان تواند دید... نخستین شرارہ کہ در خرمن صبر و ثبات زدند آن بود کہ دو تن از گروہ وام‌طلبان ، چنانکہ قاعدہ عدالت انگریزی ست ، ڈگری بحق من از عدالت حاصل کردند - چون فرجام آنست کہ یا زر مندرجہ ڈگری گزاردہ شود ، یا تن بہ بند و زندان دادہ آید و درین بارہ شاہ و گدا برابر است - آرے از بہر نام‌آوران این قدر ہست کہ سرہنگ عدالت بکاشانۂ شان نتواند رفت تا خود برہگزر یافتہ نشوند یا سیرے نروند - چون گنجائش ادائے زر نبود ، لا جرم بپاس آبرو خود را گرد آوردم و ترک نشاط سواری کردم - تا امروز ہمان بند خودداری بر پاے و دل واماندہ اقامت گراے دارم - ہمدرین گوشہ نشینی و تنگ دلی یکے از ستمگران خدا ناترس‘ کہ بعذاب ابدی گرفتار باد ؛ ولیم‌فریزر صاحب بہادر را کہ ریزیڈنٹ دھلی و غالب مغلوب را مربی ، بود در شب تاریک بضرب تفنگ کشت‘‘

ان عبارتوں سے خطوط کا زمانہ ۱۸۳۵ء معین ہوتا ہے -

میر اعظم علی کے نام خط کا زمانہ بھی یہی ہے ‘ یعنی تقریباً جولائی ۱۸۳۵ع- اس خط کے مندرجہ ذیل حصے اہم ہیں :

"...درازی زمان فراق کہ بگمان مخدوم (میراعظم علی) شانزدہ سال ست و بدانست نامہ‌نگار کم از بست سال نیست ، سر تیز کزلکی بودہ است کہ نقش آسائش از صفحۂ خاطر بدان استردہ اند ۔

آغاز ورود بدھلی کہ درد بادۂ غفلتے بقدح داشتم ، لختے از عمر پیمودن جادۂ کامروائی ہوس گزشت و بیراہہ خرامیدہ شد ، تا از سر مستی بگردید و اندران بیخودی پاے مضطبہ پیہائی و گوے فرو رفت ۔ لاجرم درہم شکستہ سراپاے و گرد اندودہ سر و روے برخاستم ۔ ھنگامۂ دیوانگی بر آور یک طرف و غوغاے وام خواھان یک سو ، آشوبے پدید آمد کہ نفس را لب و نگاہ روزنۂ چشم فراموش گردد ۔ گیتی بدین روشنی روشنان در نظر تیرہ و تار شد ، با لبے از سخن دوختہ و چشمے از خویش فرو بستہ ، جہان جہان شکستگی و عالم عالم خستگی با خود گرفتم و از بیداد روزگار نالان و سینۂ مردم تیغ مالان پکلکتہ رسیدم ۔ فرمان دھان سر بزرگی و کوچک دلی کردند و دل را نیرو بخشیدند ۔ آن ہمہ بخشایش کہ مشاھدہ رفت امید کشائش آورد و ذوق آوارگی و ھواے بیابان مرگی کہ مرا از دھلی بدر آوردہ بود بدل نماند ، و ھوس آتش کدہ‌ھاے یزد و میخانہ‌ھاے شیراز کہ دل را بسوے خود می کشید و مرا بپارس می خواند ، از ضمیر بدر جست ۔ دو سال در آن بقعہ (کلکتہ) مجاور بودم ؛ چون گورنر جنرل آھنگ ھندوستان کرد ، پیشاپیش دویدم و بدھلی رسیدم ۔ روزگار برگشت و کار ساختہ شدہ صورت تباھی گرفت ۔ اکنون ششمین سال است کہ خانہان بباد دادہ و دل بر مرگ ناگاہ نہادہ ، بکنجے نشستہ ام و درِ آمیزش بروے بیگانہ و آشنا بستہ ۔ من اگر با این ہمہ

رنج و اندوه کہ پارۂ ازان باز گفتم در نگارش‌نامہ و سپارش پیام کاہل قلم و کوتاہ دم باشم و بزرگان وطن را بیاد نیارم ؛ در عالم انصاف یزہ‌مند نیم...

مخدوم می فرماید کہ اینک از گورنمنٹ و عدالت دیوانی انجمنے در آگرہ فراہم می آید ، ہمانا راہ سگالش سپردہ است کہ مگر غالب داد خواہ بدین دادگاہ روے خواہد آورد و کار فروبستۂ او را ازین جا کشایش خواہد بود ۔ حشا ثم حشا این جمعیت جز پریشانی من نیفراید ۔ و مرا بدین ہنگامہ کار نباشد ۔ چہ عدالت دیوانی باب تظلم کہ مراست نیست و سر محکمۂ گورنمنٹ ہمان خود راے دردمندکش است کہ فگار دشنۂ بیداد اویم"[۷۸]

سراج الدین احمد کے نام مکتوب کی یہ عبارت بھی پیش نظر رکھنی ضروری ہے :

"آشکارا شد کہ مخدوم (سراج الدین) را از علاقۂ تازہ خوشنودی نیست ۔ ہر آئینہ انکشاف این معنی غبار ملال در دل فرو ریخت ؛ خدا را دل تنگ نتوان شد و کلکتہ را غنیمت باید پنداشت ۔ شارستانے بدین تازگی در گیتی کجاست ۔ خاک نشینی آن دیار از اورنگ آرائی مرزبوم دیگر خوشتر ۔ من و خدا کہ اگر متاہل نبودمے و طوق ناسوس عیال بگردن نداشتمے ، دامن بر ہرچہ ہست افشاندمے خود را دران بقعۂ رساندمے ؛ تا زیستمے دران مینوکدہ بودمے ؛ از رنج ہواہاے ناخوش[۷۹] آسودمے ۔ ہواہاے سرد و خوشا آب ہاے گوارا ، فرحا بادہ ہاے ناب ، و خرما ثمرہاے پیش رس"[۸۰]...

جناب مالک رام کا خیال یہ ہے کہ ایران جانے ؛ یزد کے آتش کدوں

شیراز کے مے خانوں اور نجف اشرف کی اقامت گزینی کی خواہش اول غالب کے دل میں کلکتہ جانے سے قبل پیدا ہوئی تھی اور کلکتے کے افسروں کی حوصلہ افزائی سے ان کی ڈھارس بندھی تھی اور مدت العمر کلکتے میں بس جانے کا ارادہ ہوا تھا[۸۱] - میرا خیال ہے ایسا کوئی قرینہ نہیں کہ ان کے دل میں یہ خواہش دلی میں پیدا ہوئی - اغلب یہی ہے کہ لکھنؤ کی ناکامی نے انہیں ایسا آزردہ کیا کہ وہ ترک وطن پر آمادہ ہوئے - کلکتے پہنچنے کے بعد انہیں وہاں کی آؤ بھگت اور موسم نے بہت متاثر کیا اور یہ خیال ان کے دل سے کچھ عرصے کے لیے نکل گیا - اسی لیے تو وہ خواہش یزد و نجف اشرف کو چھوڑ کر کلکتے کی رعنائیوں اور وہاں مستقل قیام کی خواہش کا ذکر کرتے ہیں -

غالب دیوان متداول کے دیباچے میں فرماتے ہیں :

"یا رب این بوے هستی ناشنیده از نیستی به پیدائی نارسیده ، یعنی نقش به ضمیر آمده نقاش که اسداللہ خاں موسوم و به میرزا نوشه معروف و به غالب متخلص است چنانکه اکبر آبادی مولد و دهلوی مسکن است ، فرجام کار نجفی مدفن نیز باد[۸۲]" -

دیباچے کے سنہ کے بارے میں اختلاف ہے ؛ جناب عرشی اس دیباچے کا زمانۂ تحریر ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۸ھ اور جناب مالک رام اسے قیام کلکتہ (۱۲۴۲-۱۲۴۳ھ) کا تحریر کردہ کہتے ہیں - یہ فیصلہ مشکل ہے کہ مذکورہ عبارت کب لکھی گئی -

ان اقتباسات کی روشنی میں یہ قیاس کرنا بے محل نہ ہو گا کہ

اول : غالب کے دل میں ترک ملک کا خیال باندھے اور

کلکتے کے درمیان کسی وقت پیدا ہوا ۔

دوم : کلکتے کی رہائش کے زمانے میں یہ خواہش سرد پڑ گئی ۔

سوم : واپس آکر مالی مشکلات کے عروج کے زمانے میں دوبارہ نجف اشرف کی طرف نقل مکانی کی خواہش ہوئی یعنی ۱۸۳۵ع کے آس پاس ۔

اس سے یہ منطقی نتیجہ نکالنا بے محل نہ ہوگا کہ لکھنؤ سے نکلنے کے بعد اور کلکتے پہنچنے سے پہلے یا کلکتے جا کر قریبی زمانے ہی میں قطعۂ مذکورہ کی شکل بدلی گئی ۔

(۲) غالب ۲۶ ذی قعدہ ۱۲۴۳ھ/۲۷ — جون ۱۸۲۶ع کو لکھنؤ سے نکل کھڑے ہوئے اور دو تین روز میں باندے جا پہنچے۔ نسخۂ شیرانی میں دو جگہ ''از باندہ فرستادند'' اور ''از باندہ رسیدہ'' لکھا ہے ؛ گویا یہ غزلیں باندے سے روانہ کی گئیں ۔ نسخۂ شیرانی اس وقت غالب کے پاس نہیں ہے اس نسخے کے کاتب کے پاس ہے ۔ غالب یہ غزلیں روانہ کرتے ہیں اور دیوان کے حاشیے پر درج ہو جاتی ہیں ۔ اس سے یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان غزلوں کی روانگی کا زمانہ لکھنؤ والے قطعے کی ترمیمی صورت کے وقوع پذیر ہونے سے قبل کا ہے ۔ باندے سے روانگی کے بعد اور کلکتے کے ورود سے قبل یا کچھ بعد قطعۂ زیر بحث کی ترقی یافتہ صورت ضبط تحریر میں آئی اور یہ نسخۂ شیرانی میں درج نہیں ہو پائی ۔

(۳) نسخۂ شیرانی میں قیام کلکتہ کی مندرجہ ذیل چیزیں

بھی نہیں ہیں :

(الف) کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے اے ندیم
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ھائے ھائے (کل اشعار)

(ب) چکنی ڈلی پر کہا ہوا ارتجالی قطعہ (کل اشعار)

(ج) اور ابوالقاسم کی توصیف میں کہی ہوئی غزل جس کا مطلع ہے :

دیکھنے میں ہیں گر چہ دو پر ہیں دونوں یار ایک (کذا)
وضع میں گو ہوئی دو سر تیغ ہے ذوالفقار ایک (کذا)
(کل ۱۱ اشعار)

اس سے اس قیاس کو تقویت ہوتی ہے کہ باندے سے روانہ شدہ کلام کے بعد کوئی شعر نسخۂ شیرانی میں اضافہ نہیں ہو سکا ۔ نسخۂ شیرانی میں اضافوں کی آخری حد ان کے قیام باندہ کو قرار دینا زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے ، یعنی اواخر ذی قعدہ ۱۲۴۳ھ/ اواخر جون ۱۸۲۷ع کے بعد کا کوئی کلام نسخۂ شیرانی میں نہیں ہے ۔ یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ غالب کی اصلاحیں اور حاشیے پر ان کے ھاتھ کی غزل کلکتے سے واپسی کے بعد کی ہو ۔ اس کے بارے میں میرا استدلال یہ ہے :

(الف) اگر ایسا ہوتا تو غالب کا وہ کلام بھی اس میں شامل ہوتا جو کلکتے میں کہا گیا تھا ۔ خاص کر چکنی ڈلی والے اشعار جو متداول نسخے میں شریک ہیں کوئی وجہ نہیں کہ وہ نسخۂ شیرانی میں شامل نہ کیے جاتے ۔

(ب) نسخۂ شیرانی اس وقت غالب کے ہمراہ نہ تھا بقول مالک رام اس کا مبیضہ غالب کے پاس تھا۔ جو اصلاحیں نسخۂ شیرانی میں ملتی ہیں ان کی جھلک ہمیں گل رعنا میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ یہ مسلمہ ہے کہ گل رعنا انہوں نے مولوی سراج الدین احمد کی فرمایش پر قیام کلکتہ کے زمانے میں مرتب کی تھی۔ اس میں درج شدہ اشعار کی وہی آخری شکل ہے جو نسخۂ شیرانی میں پائی جاتی ہے۔ گل رعنا کے ۴۵۵ اردو اشعار میں ترمیم شدہ صورت ہے تو باقی اشعار کے لیے (جو اس انتخاب میں آئے) یہ کیوں فرض کیا جائے کہ ان کی ترمیم کلکتے سے واپسی کے بعد ہوئی۔

(ج) نسخۂ حمیدیہ اور نسخۂ شیرانی اور گل رعنا کے تقابلی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر نئے نسخے کی تیاری میں غالب کی کوشش یہ رہی ہے کہ وہ پرانے کلام کو سختی سے منتخب کرتے ہیں اور تازہ کہے ہوئے کلام کو پورے کا پورا قایم رکھتے ہیں۔ حتی کہ گل رعنا کے مختصر انتخاب میں بھی بقول مالک رام تازہ کہی ہوئی غزلوں کے اشعار بہت زیادہ ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ نسخۂ شیرانی غالب کے پاس رہتا تو وہ اس میں سارا تازہ کلام محفوظ نہ کرتے۔

(د) گل رعنا میں ایک شعر ایسا بھی ہے جو غالب کا پسندیدہ اور انتخاب کے قابل سمجھا گیا لیکن نسخۂ شیرانی سے غیر حاضر ہے:

سادگی پر اس کے مر جانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

یہ غزل نسخۂ شیرانی سے غیر حاضر ہے اگر کلکتے سے لوٹ کر غالب کے پاس نسخۂ شیرانی ہوتا تو یہ غزل اس میں شامل کی جاتی ۔

(۵) غالب کا کلکتے میں جو ادبی معرکہ ہوا اس میں وہ ہندوستانیوں کی فارسی کے دشمن اور ایرانی طرز و زبان کے بے حد قائل ہو گئے تھے اس سلسلے میں "زال" اور "ذال" کا قصہ بھی زیر بحث آیا ہے ۔ غالب اس بات سے مقر ہیں کہ "زال فارسی" کا وجود نہیں ہے ۔ وہ فارسی الفاظ کو سختی کے ساتھ ذال کی بجائے "ز" سے لکھنے پر عمل پیرا ہوئے ۔ ان کے نقطۂ نظر کا یہ کرشمہ کلکتے کے جھگڑے کا شاخسانہ ہے ۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

"دیگر ہم دران صحیفہ مندرج بود مت کہ گذاشتن و گذشتن و پذیرفتن بہ رائے هوز نوشتن غلطیٔ املا است ۔ نکتہ شناسا ! غلطی املا وقتے می توان گفت کہ دانا بدان نباشد و سہو در تحریر افتد ، حال آنکہ تحقیق ما برائے ما کافی و در نفس خویش تمام است ۔ اگر بپذیرند از شادی نہ بالیم و اگر خردہ گیرند از اندوہ نہ نالیم ۔ طرز تحریر را غلطی املا گفتن غلط است ۔ آرے اگر غلطی تحریر گویند خصوصتے نیست ۔ بالجملہ غلطی املا آنست کہ مثلاً ولدالحرام را کسے بہ ھائے ہوز انشا کند و ثالث را بہ ہر دو سین مہملہ بنویسید یا ہمچنیں اعتراض را بہ زائے ہوز نگارد ، و ضبط را بہ تائے قرشت رقم زند و قس علیٰ ھذا" ۔۸۳

غالب بعد کی زندگی میں اس اصول پر اتنی سختی سے عمل پیرا

ہوئے کہ اس کے نشانات شاگردوں کی اصلاحوں کے علاوہ دیوان اردو کے ان قلمی نسخوں میں بھی نظر آتے ہیں جو غالب کے زیر مطالعہ رہے ۔ اگر نسخۂ شیرانی کلکتے سے واپسی پر غالب کی دسترس میں ہوتا تو اس میں وہ ضرور فارسی الفاظ میں ، ذ ، کی جگہ '' ز '' بنا دیتے ۔ زیر نظر نسخے میں جا بجا ''ز'' قایم ہے جو غالب کے مسلک کی خلاف ورزی کر رہا ہے ۔

ان براہین کی مدد سے ہم یہ بے تامل کہہ سکتے ہیں کہ نسخۂ شیرانی پر غالب کے ھاتھ کی لکھی ہوئی غزل اور غالب کے ھاتھ کی دیگر اصلاحیں ان کے دلی سے کلکتے جانے سے قبل (یعنی محرم ۱۲۴۲ھ سے قبل) کی ہیں اور وہ غزلیں جو حاشیے پر درج ہیں ھر حالت میں ۲۸ ذی قعدہ ۱۲۴۳ھ سے پہلے کی کہی ہوئی ہیں ، جب وہ باندے سے کلکتے کی طرف روانہ ہو رہے تھے ۔ گویا ہمارے حساب سے نسخۂ شیرانی کی کتابت کی آخری حد محرم ۱۲۴۲ھ سے قبل اور اضافوں کی آخری حد اواخر ذی قعدہ ۱۲۴۳ھ فرض کرنا ہو گی ۔

قاضی عبدالودود صاحب نسخۂ شیرانی کی کتابت کے بارے میں لکھتے ہیں :

''نسخۂ شیرانی کا زمانہ کتابت قیاساً مائۂ سیزدھم کے عشرۂ چہارم کے نصف اول کے بعد اور ۱۲۳۵ھ سے قبل متصور ہو گا''[۸۴]

ان کی رائے کے مطابق نسخۂ شیرانی کی کتابت ۱۲۳۱ھ/۱۲۳۵ھ سے قبل نہیں بعد میں ہوئی ۔ اور یہ کہ ۱۲۳۵ھ کے بعد اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ۔

(۵)

نسخۂ بھوپال کی کتابت ۵ صفر ۱۲۳۷ھ میں ہوئی۔ میری رائے میں اس کے بعد اس کے حواشی پر اشعار کی ترمیم و اصلاح، اشعار کا اضافہ اور نئی غزلوں کا اندراج ہوا اور ردیف یے کی آخری غزلیں بھی اضافہ ہوئیں، لیکن نسخۂ شیرانی کی حاشیے والی غزلوں سے قطع نظر، خود متن میں جو غزلیں شامل ہیں اور نسخۂ بھوپال کے حواشی اور متن سے غیر حاضر ہیں وہ اس وقت تخلیق کی گئی ہوں کی جب نسخۂ بھوپال غالب کے ہاتھ سے جا چکا تھا۔ غالب شناسوں کی رائے یہ ہے کہ نسخہ ۱۸۲۶ع/۱۲۴۲ھ تک (سفر کلکتہ تک) غالب کی تحویل میں رہا اگر یہ درست ہے تو اس کا کیا قرینہ ہے کہ نسخۂ بھوپال کے حاشیوں پر بعض غزلیں تو اضافہ ہوئیں اور انہوں نے نسخۂ شیرانی کے متن میں جگہ پائی؛ لیکن نسخۂ شیرانی کے متن کی کچھ غزلیں نسخۂ بھوپال کے حاشیے پر اضافہ نہ ہوئیں۔ میرا خیال ہے کہ نسخۂ بھوپال غالب کے سفر کلکتہ سے پہلے ان کی دسترس سے نکل چکا تھا ورنہ اس کے حاشیوں پر ان غزلوں کا اضافہ ضرور ہوتا جو نسخۂ شیرانی کے متن میں ہیں اور نسخۂ بھوپال کے حواشی و متن دونوں سے غائب ہیں۔ صفر ۱۲۳۷ کے بعد جو غزلیں نسخۂ بھوپال میں اضافہ نہ ہوئیں ان کی تعداد ۴۲ سے کم نہیں اور متفرق اشعار اس کے علاوہ ہیں۔ بظاہر یہ نیا کلام بھی دو تین برس کی مدت ضرور لے گیا ہے۔ یہ سارا کلام نسخۂ شیرانی کے متن میں شامل ہے تو یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ نسخۂ شیرانی کی کتابت کا کام ان غزلوں کی تحریر کے بعد شروع ہوا۔ عجب نہیں کہ نسخۂ شیرانی کی کتابت ۱۲۴۰ھ کے قریب شروع ہوئی ہو اور ۱۲۴۲ھ سے کچھ پہلے مکمل ہوئی ہو۔ کیونکہ کچھ اضافے نسخۂ شیرانی کے حاشیوں پر بھی ہیں جن سے نسخۂ بھوپال خالی ہے۔

(۶)

نسخۂ بھوپال اور نسخۂ شیرانی کے تقابلی مطالعے سے بعض غزلوں کے زمانۂ تحریر کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔

نسخۂ حمیدیہ کے حاشیے پر ایک غزل درج ہے جس کے دو شعر یہ ہیں :

دوست غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

ہے اب اس معمورے میں قحط غم الفت اسد
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں، کھائیں گے کیا

یہ غزل نسخۂ حمیدیہ کے حاشیے پر ہے اس سے قطعی طور پر ظاہر ہے کہ ۱۸۲۱ع/۱۲۳۷ھ کے بعد کہی گئی۔ غالب کی پنشن کا قصہ ۱۸۲۶ع سے شروع ہوا۔ وہ اس زمانے میں مالی طور پر پریشان رہنے لگے تھے۔ اس سے ضمنی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نسخۂ بھوپال کم از کم ۱۸۲۶ع تک ضرور غالب کی دسترس میں رہا ہے۔

یہ غزل نسخۂ بھوپال کے حاشیے پر ہے اور نسخۂ شیرانی کے متن میں شامل ہے۔ گویا اس زمانے میں نسخۂ شیرانی ابھی کتابت کے مراحل میں تھا اور کتابت مکمل نہیں ہوئی تھی ورنہ یہ غزل متن کی بجائے حاشیے پر درج ہوتی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نسخۂ شیرانی کے متن کی تکمیل ۱۸۲۶ع کے بعد اور غالب کے سفر کلکتہ پر روانہ ہونے سے قبل (محرم ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۶ع) ہو چکی تھی اور وہ اس پر ترمیم و اصلاح بھی کر چکے تھے اور کم از کم ایک غزل کا اضافہ خود اپنے قلم سے حاشیے پر کر چکے تھے۔

نسخۂ حمیدیہ کے متن میں ایک غزل ہے جس کا آخری شعر ہے :

دھلی کے رہنے والو اسد کو ستاؤ مت
بیچارہ چند روز کا یاں مہمان ہے

(صفحہ ۱۶۴)

نسخۂ حمیدیہ میں ایک غزل اور ہے جس کا مقطع یوں درج ہے :

گر مصیبت تھی تو غربت میں اٹھا لیتے اسد
میری دلی ہی میں ہونی تھی یہ خواری ھائے ھائے

یہ غزل نسخۂ حمیدیہ کی طرح نسخۂ شیرانی کے متن میں درج ہے ۔ یہ شعر مروجہ دیوان میں یوں ہے :

عشق نے غالب ابھی پکڑا نہ تھا وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوق خواری ہائے ہائے

نسخۂ حمیدیہ کے متن میں ان اشعار کی موجودگی ظاہر کرتی ہے کہ اس زمانے تک غالب پر اہل دھلی کی "نوازشوں" کا آغاز ہو چکا تھا اور انہیں کچھ شکایات پیدا ہو چکی تھیں ۔ اگرچہ یہ تعین مشکل ہے کہ ان شکایات کی نوعیت کیا تھی ۔

مندرجہ ذیل غزل نسخۂ شیرانی میں ہے اور نسخۂ بھوپال میں نہیں ہے جس کا یہ شعر غور طلب ہے :

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا

یہ وہ رنگ گفتگو ہے جو غالب کے کلام کی ان سب غزلوں میں جھلکتا ہے جو نسخۂ شیرانی کے حاشیے پر ہیں اور غالب کے مالی مسائل کی آئینہ دار ۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو اس غزل کو ان

کی پنشن کے قضیے سے علاقہ ہے اور ۱۸۲۶ع کے قریبی زمانے کا کلام جاننا چاہیے۔

وہ آکے خواب میں تسکین اضطراب تو دے
ولے مجھے تپش دل مجال خواب تو دے
پلا دے اوک سے ساقی جو مجھ سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

غالب خود علاءالدین احمد خاں علائی کے نام ۲۷ جولائی ۱۸۶۴ع کے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ پچاس برس پہلے یہ غزل الٰہی بخش مرحوم کی زمین میں کہی تھی[۸۵]

یہ غزل نسخۂ حمیدیہ میں نہیں ہے۔ الٰہی بخش معروف کا انتقال ۱۸۲۶ع/۱۲۴۳ھ میں اس وقت ہوا جب غالب کلکتے کے سفر میں تھے۔ اس سے قیاس ہو سکتا ہے کہ یہ غزل ۱۲۴۳ھ سے قبل ہی کہی گئی اور نسخۂ شیرانی کے متن میں شامل ہوئی۔ اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ:

(۱) نسخۂ حمیدیہ ۱۸۲۱ع/۱۲۳۷ھ (تکمیل کتابت) بعد کے اور ۱۸۲۶ع/۱۲۴۲ھ سے کچھ پہلے تک غالب کی دسترس میں رہا۔

(۲) نسخۂ شیرانی کے متن کی کتابت کا عمل قیاساً ۱۲۴۰ھ کے آس پاس شروع ہو کر ۱۲۴۱ھ کے اواخر تک جاری رہا۔ اس سنہ میں کس وقت نسخہ مکمل ہوا اور اس کی ترمیم و اصلاح ہوئی اور حاشیے پر غالب نے اپنے ہاتھ سے کم از کم ایک غزل اضافہ کی۔ نسخۂ شیرانی کی باقی غزلیں جو حاشیوں پر ہیں ۱۸۲۶/۱۲۴۲ع اور ۱۸۲۷ع کے مابین کسی وقت

داخل نسخہ ہوئی ہوں تو عجب نہیں ، اگرچہ اس کا بھی امکان ہے کہ ان دو غزلوں کو چھوڑ کر جو باندے سے بھیجی گئیں اور اس غزل کو الگ کر کے جس میں لکھنؤ کا ذکر ہے ۔ حاشیے کی باقی غزلیں کلکتے کی طرف روانہ ہونے سے قبل ہی داخل نسخہ ہو گئی ہوں ۔

(۲) نسخۂ شیرانی کا متن زیر کتابت تھا اور ابھی متن کی تکمیل نہیں ہوئی تھی کہ نسخۂ بھوپال غالب کی پہنچ سے باہر ہو گیا ۔ بعض غزلیں نسخۂ شیرانی کے متن میں درج ہوئیں اور نسخہ بھوپال کے حاشیوں پر نہ آ سکیں ۔

(۳) عرشی صاحب کا یہ قیاس صحیح معلوم ہوتا ہے کہ نسخۂ شیرانی کی تکمیل کتابت کے بعد اس کا ایک مبیضہ تیار ہوا جو سفر کلکتہ میں غالب کے ہمراہ تھا اور جس کی بنیاد پر گل رعنا کا انتخاب عمل میں آیا ۔

یہ بحث نامکمل رہے گی اگر ہم دو اور امور زیر بحث نہ لائیں کیونکہ نسخۂ بھوپال اور نسخۂ شیرانی کے تقابلی مطالعے میں ان کی بھی اہمیت ہے :

(الف) نسخۂ بھوپال کے حاشیوں کی کل درج شدہ غزلیں نسخۂ شیرانی کے متن میں شامل ہیں ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک ہی زمانہ میں نسخۂ بھوپال اور نسخۂ شیرانی کاتبوں کے سپرد تھے ۔ اس وقت نسخۂ بھوپال مکمل تھا اور اس کے حاشیوں پر نسخۂ شیرانی نامکمل تھا اور اس کے متن میں اضافے ہو رہے تھے ۔

(ب) نسخۂ بھوپال کی بعض غزلیں نسخۂ شیرانی کی کتابت

سے خارج کی گئی تھیں ایسے مقامات پر بقول عرشی نسخۂ بھوپال پر "ع" کا حرف درج ہے اور یہ غزلیں نسخۂ شیرانی کے متن میں نقل نہیں کی گئیں ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ غالب کا نسخۂ بھوپال زیادہ مکمل ہے اور نسخۂ شیرانی جو اس کا مبیضہ ہے اس میں بہت سی غزلیں خارج ہیں ۔

نسخۂ بھوپال کے حاشیوں کی مکمل غزلیں

ذیل میں شق 'الف' اور 'ب' کی تفصیل پیش کی جاتی ہے ۔ یہ فہرست عرشی صاحب کے حواشی، نسخۂ حمیدیہ طبع اول اور نسخۂ حمیدیہ (طبع ثانی) کی مدد سے تیار کی گئی ہے :

(۱) بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

(۲) گر نہ احوال شب فرقت بیاں ہو جائیگا
بے تکلف داغ مہ مہر دہاں ہو جائے گا

(۳) دھمکی میں مر گیا جو نہ باب نبرد تھا
عشق نبرد پیشہ طلبگار مرد تھا

(۴) محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

(۵) دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جائینگے کیا

(۶) عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

(۷) پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موج شراب
دے بط مے کو دل و دست شنا موج شراب

(۸) رہا گر کوئی تا قیامت سلامت
پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت
(۱۰ شعر)

(۹) کب فقیروں کو رسائی بت میخوار کے پاس
تونبے بو دیجیے میخانے کی دیوار کے پاس
(۸ شعر)

(۱۰) ہے کس قدر ہلاک فریب وفائے گل
بلبل کے کاروبار پر ہیں خندہ ہائے گل
(۱۱ شعر)

(۱۱) خوں در جگر نہفتہ بزردی رسیدہ ہوں
خود آشیان طائر رنگ پریدہ ہوں
(۷ شعر)

(۱۲) مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

(۱۳) وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز ماہ و سال کہاں
(۱۰ شعر)

(۱۴) وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

(۱۵) مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے
بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے

(۱۶) عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
مری وحشت تری شہرت ہی سہی

نسخۂ بھوپال کے آخر میں اضافہ شدہ غزلیں ۔

(۱۷) دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

(۱۸) پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے
سینہ جویائے زخم کاری ہے

(۱۹) گرم فریاد رکھا شکل نہالی نے مجھے
تب اماں ہجر میں دی برد لیالی نے مجھے

(۲۰) چاہیے خوباں کو جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے

(۲۱) وہ آ کے خواب میں تسکین اضطراب تو دے
ولے مجھے تپش دل مجال خواب تو دے

(۲۲) کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آ جائے ہے مجھ سے
جفائیں کرکے اپنی یاد ، شرما جائے ہے مجھ سے

(۲۳) مدت ہوئی ہے یار کو سہماں کیے ہوئے
جوش قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

وہ غزلیں جو نسخۂ بھوپال میں ہیں لیکن نسخۂ شیرانی میں نہیں :

بسان جوہر آئینہ ، از ویرانی دل ھا
غبار کوچہ‌ھائے موج ہے خاشاک ساحل ھا
بشغل انتظار مہ و شان در خلوت شب ھا
سر تار نظر ہے رشتۂ تسبیح کوکب ھا
وحشی بن صیاد نے ہم رم خوردوں کو کیا رام کیا
رشتۂ چاک حبیب دریدہ صرف قماش وام کیا

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگی جا کا
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا
ورد اسم حق سے دیدار صنم حاصل ہوا
رشتۂ تسبیح تار جادۂ منزل ہوا
ہے تنگ ز واماندہ شدن حوصلۂ پا
جو اشک گرا خاک میں ہے آبلۂ پا
بسکہ عاجز نا رسائی سے کبوتر ہو گیا
صفحۂ نامہ غلاف بالش پر ہو گیا
گرفتاری میں فرمان خط تقدیر ہے پیدا
کہ طوق قمری از ہر حلقۂ زنجیر ہے پیدا
بمہر نامہ جو بوسہ گل پیام رہا
ہمارا کام ہوا اور تمھارا نام رہا
سحرگہ باغ میں وہ حیرت گلزار ہو پیدا
اڑے رنگ گل اور آئینۂ دیوار ہو پیدا
دود شمع کشتۂ گل بزم سامانی عبث
یک شبہ آشفتہ ناز سنبلستانی عبث
شیشۂ آتشیں رخ پر نور
عرق از خط چکیدہ، روغن مور
میں ہوں سراب یک تپش آموختن ہنوز
زخم جگر ہے تشنۂ لب دوختن ہنوز
اگر وہ آفت نظارہ جلوہ گستر ہو
ہلال ناخنک دیدہ‌ہائے اختر ہو
خشکیٔ مے نے تلف کی مے کدے کی آبرو
کاسۂ دریوزہ ہے پیمانۂ دست سبو
ہر عضو غم سے ہے شکن آسا شکستہ دل
جوں زلف یار ہوں میں سراپا شکستہ دل

بقدر لفظ و معنی فکرت احرام گریباں میں
وگرنہ کیجیے جو ذرہ عریاں ہم نمایاں ہیں

بسکہ زیر خاک با آب طراوت راہ ہے
ریشہ سے ہر تخم کا دلو اندرون چاہ ہے[۸۶]

یہ سر نوشت میں میری ہے اشک افشانی
کہ موج آب ہے ہر ایک چین پیشانی

(غلط)

دلا عبث ہے تمنائے خاطر افروزی
کہ بوسۂ لب شیریں ہے اور گلو سوزی

(غلط)

محو آرامیدنی سامان بے تابی کرے
چشم میں توڑے نمک داں تا شکر خوابی کرے

(غلط)

ہجوم نالہ حیرت عاجز عرض یک افغاں ہے
خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے

بہر پروردن سراسر لطف گستر سایہ ہے
پنجۂ مژگاں بہ طفل اشک دست دایہ ہے

چشم گریاں بسمل شوق بہار دید ہے
اشک ریزی عرض بال افشانی امید ہے

زلف سیاہ افعی بد قلمی ہے
ہر چند خط سبز و زمرد رقمی ہے

دریوزۂ ساماں ہا اے بے سروسامانی
ایجاد گریباں ہا در پردۂ عریانی

شبنم بہ گل لالہ نہ خالی ز ادا ہے
داغ دل بے درد نظر گاہ صبا ہے[۸۷]

(۸)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر نسخۂ شیرانی کا مالک کون تھا ؟ شیخ ایس۔ ایم ۔ اکرام کی رائے میں اس کا مالک دلی یا لکھنؤ کا کوئی شخص تھا جسے غالب اپنا کلام سفر میں بھیجتے رہے ۔ لکھنؤ والے قیاس کا کیا قرینہ ہے اس کا علم مجھے نہیں ہے - مالک رام نسخے کی ملکیت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ نسخے کے مالک یا نیر رخشاں ہیں یا پھر حسین مرزا ہو سکتے ہیں -

مالک رام صاحب کے اس قیاس کی اساس مندرجہ ذیل دو بیانات پر ہے :

(۱) ”معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی نظم و نثر خود ان کے پاس کبھی جمع نہیں ہوئی ۔ ان کے بعض دوستوں اور نیازمندوں نے ان کی تحریرات کے جمع کرنے کا اہتمام کیا تھاجس میں سے نواب ضیاءالدین احمد خاں نیر رئیس لوھارو اور ذوالفقارالدین حیدر حسین مرزا خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ نواب ضیاءالدین احمد خاں نے غدر سے قبل غالب کی سب تحریروں کو جمع کر کے ان کی پر تکلف جلدیں بندھوا لی تھیں ، لیکن یہ مجموعے غدر میں لٹ گیے ۔ غالب منشی شو نراین اکبرآبادی کو لکھتے ہیں :

ضیاءالدین خاں جاگیردار لوھارو میرے سببی بھائی اور میرے شاگرد رشید ہیں ۔ نظم و نثر میں نے جو کچھ لکھا انہوں نے لے لیا اور جمع کیا - چنانچہ کلیات نظم فارسی چون پچپن جزو اور پنج آہنگ اور مہر نیم روز اور دیوان ریختہ سب مل کر سو سو

جزو مطلاً اور مذہب اور انگریزی ابری کی جلدیں ۔
کوئی ڈیڑھ سو اور سو روپے کے صرف میں بنوائیں ۔
میری خاطر جمع کہ میرا کلام سب یک جا فراہم
ہے ۔ پھر ایک شہزادے نے اس مجموعۂ نظم و نثر
کی نقل کی ۔ اب دو جگہ میرا کلام اکٹھا ہوا ۔ کہاں
سے یہ فتنہ (غدر) برپا ھوا اور شہر لٹے ۔ وہ دونوں
جگہ کا کتاب خانہ خوان یغما ہو گیا ۔ ہر چند میں
نے آدمی دوڑائے کہیں سے ان میں سے کوئی کتاب
ھاتھ نہ آئی ۔ وہ سب قلمی ہیں ۔ غرض اس تحریر سے یہ
ہے کہ قلمی فارسی کا کلیات ، قلمی ھندی کا کلیات ،
قلمی پنج آھنگ ، قلمی مہر نیم روز اگر ان میں سے
کوئی نسخہ بکتا ہوا نظر آئے تو اس کو میرے واسطے
خرید کر لینا اور مجھ کو اطلاع کرنا میں قیمت
بھیج کر منگا لوں گا''۸۸

(۲) ''اواخر عمر میں اپنا کلام اپنے پاس نہ رکھتے تھے
اردو کی تصانیف نواب حسین مرزا صاحب کے پاس
رھتی تھیں اور ترتیب کرتے جاتے تھے ۔ فارسی
نواب ضیاءالدین احمد خاں صاحب کو بھیج دیتے تھے ،
کہ انہیں نیر رخشاں تخلص کر کے اپنا شاگرد رشید
اور خلیفۂ اول قرار دیا تھا ۔ خلیفہ دوم نواب‌علاؤالدین
خاں صاحب تھے''۸۹

لیکن نیر رخشاں اور حسین مرزاکے حالات زندگی نسخۂ شیرانی
کے بارے میں اس قیاس کی تردید کرتے ہیں ۔ نسخۂ شیرانی کی
تکمیل ۱۲۴۲ھ تک ہو چکی تھی ۔ اب اس وقت ان صاحبوں کی
عمر کیا تھی ؟ مالک رام خود ان دونوں صاحبوں کے

حالات تلامذہ غالب میں لکھتے ہیں - ضروری اقتباس یہ ہیں -

نیر رخشاں کے بارے میں لکھتے ہیں :

"نواب احمد بخش خاں نے اپنے پیچھے چار بیٹے چھوڑے ایک بیوی سے شمس الدین احمد خاں (متوفی ۱۸۳۵ء) اور ابراھیم علی خان اور دوسری سے نواب امین الدین احمد خاں اور نواب ضیاءالدین احمد خاں ۔ شمس الدین احمد خاں اپنے والد ماجد کی عین حیات ۱۸۲۶ء میں فیروز پور جھرکہ کے حکمران ہو گئے تھے - لوھارو کی جاگیر نواب احمد بخش خاں نے اپنے دوسرے بیٹوں کے نام لکھ دی...نواب احمد بخش خاں اکتوبر ۱۸۲۷ء/ربیع الاول ۱۲۴۳ھ میں فوت ہوئے "سینو مقام فخرالدولہ" تاریخ وفات ہے -

نواب ضیاءالدین خاں اپنے والد بزرگوار کی وفات کے وقت ۶ برس کے تھے یہ فیروز پور جھرکہ میں اکتوبر ۱۸۲۱ء میں پیدا ہوئے "۹۰

اس بیان سے یہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ غالب کے سفر کلکتہ کے وقت ضیاءالدین احمد خاں نیر رخشاں کی عمر صرف چھ برس تھی ایسے میں نسخۂ شیرانی کی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔۹۱

حسین مرزا کے بارے میں مالک رام لکھتے ہیں :

"سجاد مرزا کے والد نواب معین الدولہ ، صفدرالملک ذوالفقارالدین حیدر بہادر ذوالفقار جنگ المعروف بہ ناظر حسین مرزا ، غالب کے نہایت گہرے دوست تھے

بلکہ فارسی میں ان کے شاگرد بھی تھے ۔ اگرچہ شعر
نہیں کہتے تھے لیکن بلا کے سخن فہم اور سخن سنج
تھے ۔ غالب کا اردو کلام انہیں کے ہاں جمع ہو
رہا تھا جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں وقف تاراج ہو
گیا ۔ یہ شاہی ناظر خاصہ تھے اور بہادر شاہ کی سرکار
سے انہیں نظارت خاں بہادر کا خطاب ملا تھا ۔ ۶ رمضان
۱۳۰۶ ہجری/۶ مئی ۱۸۸۹ء کو ۷۳ برس کی عمر
میں انتقال کیا،،[۹۲]

حسین مرزا کی عمر ۱۳۰۶ هجری میں ۷۳ برس کی تھی تو
ان کی پیدائش ۱۲۳۳ ہجری میں ہو گی ۔ اس تخمینے کے مطابق
۱۲۴۳ ہجری میں اس کی عمر دس برس کی تھی ۔ یہاں بھی نسخۂ
شیرانی کی ملکیت کا سوال محل نظر ہے[۹۳]

غالب کے دوستوں کے حلقے میں اس نسخے کی ملکیت کو
تلاش کرنے کے لیے ان کے شاگردوں میں نہیں حلقۂ احباب میں جستجو
کرنی پڑے گی ۔ کلکتے سے غالب کی خط و کتابت جن صاحبوں سے
رہی ان میں علی بخش رنجور برادر نسبتی مرزا غالب ، جو عمر میں
غالب سے صرف چار برس چھوٹے تھے ، فضل حق خیرآبادی ،
نواب امین الدین احمد خاں ، نواب حسام الدین حیدر (پدر حسین مرزا)
اور رائے چھجمل کے نام لیے جا سکتے ہیں ۔ ان میں سے غالب کے
زیادہ گہرے تعلقات نواب حسام الدین حیدر نامی اور رائے چھجمل
سے معلوم ہوتے ہیں ۔ رائے چھجمل کی اہمیت یوں بھی ہے کہ دلی
میں غالب اپنے معاملات ان کے سپرد کر گئے تھے اور غالب کے
فارسی خطوط اس کی تائید کرتے ہیں ۔ رائے چھجمل کے ہاتھ کا لکھا
ہوا ایک فارسی دیوان بانکی پور لائبریری پٹنہ میں ہے ، جو غالب
کے فارسی دیوان کا قدیم ترین نسخہ ہے ۔ یہ دیوان ۱۲۵۴ ہجری

کا مکتوبہ ہے ۔ رائے چھجمل کے تعلقات غالب کے ساتھ آخر تک نہایت گھرے رہے ۔ ان کے دونوں بیٹے جواہر سنگھ جوہر اور ھیرا سنگھ درد غالب کے شاگرد تھے ۔ سفر کلکتہ سے لے کر رائے چھجمل کی وفات تک (۱۲۷۷ہجری) یہ روابط بہت گھرے رہے ، ہفتے میں دو تین بار ملاقات رہتی تھی ۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ شاید نسخۂ شیرانی ان کی ملک ہو یا پھر حسین مرزا کے والد نواب حسام الدین حیدر اس نسخے کے مالک ہوں ۔ حسام الدین حیدر نامی (متوفی ۳ اکتوبر ۱۸۴۶ء/۲۲ شوال ۱۲۶۲ہجری) غالب کے خسر نواب الٰہی بخش معروف کے دوستوں میں تھے ۔ قیاس ہے کہ غالب سے عمر میں بڑے ہوں گے ۔ اس خانوادے سے غالب کے تعلقات کی بناء پر عرشی قیاس کرتے ہیں کہ غالب کا تشیع انہیں کے گھرانے کے زیر اثر ہے ۔ اس سے تعلقات کی گہرائی کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔ عجب نہیں کہ غالب کا اردو کلام خصوصاً نسخۂ شیرانی ان کی ملکیت رہا ہو ۔ اس بارے میں قطعی طور پر کچھ کہنا ممکن نہیں اتنا ضرور ہے کہ یہ نسخہ کسی ایسے شخص کی ملکیت رہا ہے جس سے غالب کے اتنے تعلقات تھے کہ انہیں سفر کے دوران میں کلام بھیجتے رہے ۔

حواشی

۱- یہ ذخیرہ پنجاب یونیورسٹی نے ۱۹۴۲ع میں مرحوم حافظ محمود شیرانی سے خرید لیا تھا۔

۲- ''یہ نسخہ ۱۹۲۸ع کے قریب مرتب ہو کر کچھ ہی بعد حیدر آباد سے چھپنا شروع ہوا مگر کسی وجہ سے ناتمام رہ گیا اس کا ایک حصہ ۲- جنوری ۱۹۳۵ع کو محب مکرم جناب سید تمکین کاظمی صاحب کے قبضے میں آیا اور انھوں نے از راہ کرم حیدر آباد سے میرے (امتیاز علی عرشی کے) پاس بھیج دیا۔ یہ دیوان صفحہ ۱۷ سے صفحہ ۱۲۶ تک ہے'' (دیوان غالب (اردو) نسخۂ عرشی، طبع ۱۹۵۸ع دیباچہ (صفحہ ۱۱۵) ''جس مطبع میں (نسخۂ لطیف) چھپ رہا تھا بد قسمتی سے اس میں آگ لگ گئی اور اس میں جو کچھ تھا جل کر خاک سیاہ ہو گیا۔ اس حادثے میں ان کے (لطیف کے) مرتبہ دیوان کا مسودہ بھی ضائع ہو گیا پھر دوسری مصروفیتوں کے سبب وہ اس طرف توجہ نہ کر سکے'' (فکر و نظر، جنوری ۱۹۶۱ع، مقالہ مالک رام صفحہ ۱۳۵)

[متن میں اس فٹ نوٹ کا نمبر غلط طور پر ۲ کی بجائے ۲ چھپ گیا ہے]

۳- کتاب مذکور، طبع ثانی، اپریل ۱۹۲۹ع - صفحہ ۲۰ ببعد-

۴- اکرام صاحب اپنی کتاب کے مختلف ایڈیشنوں کے سرورق پر سنین اشاعت درج نہیں کرتے۔ تاہم مختلف اشاعتوں میں بعض اشارے سنین کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ غالب نامے کی اشاعت اول پر سنہ نہیں ہے لیکن حکیم فرزانہ کے دیباچے میں اشاعت اول کا سنہ انھوں نے دسمبر ۱۹۳۶ع دیا ہے. (کتاب مذکور صفحہ ۱۰) کتاب کی دوسری اشاعت ۱۹۳۹ع میں (دیباچہ ارمغان غالب صفحہ

۔۷) اور تیسری اشاعت ۱۹۴۲ء میں ہوئی (تیسری طباعت میں لکھا ہے کہ آج سے آٹھ سال پہلے ہم نے غالب نامہ ... مرتب کیا ... دیکھیے صفحہ ۷) - پہلی اشاعت ۱۹۳۶ء کی ہے اس حساب سے اس تیسری طباعت کا سنہ ۱۹۴۲ء قرار دیا گیا ہے چوتھی طباعت (یا پانچویں اشاعت) ۱۹۵۷ء میں ہوئی ان اشاعتوں کے سلسلے میں ایک دوسری الجھن یہ بھی ہے کہ شیخ صاحب ہر ایڈیشن میں اپنی کتابوں کے نام بدل دیتے ہیں جن سے قاری کو خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے - چشمۂ کوثر ' موج کوثر ' رود کوثر ' آب کوثر کے سلسلہ کی طرح غالب نامہ جو اول ایک جلد میں تھا بعد میں تقسیم ہو کر دو جلدوں میں آثار غالب اور ارمغان غالب کہلایا ' لیکن آخری ایڈیشن میں حکیم فرزانہ اور حیات غالب کی دو جلدوں کے بعد ارمغان غالب کی تیسری جلد کی توقع ہے - اس انتشار کی وجہ سے مذکورہ بالا اقتباسات میں قارئین کو مختلف طباعتوں اور مختلف ناموں سے سابقہ پڑے گا اس کے لیے ہم قارئین سے معذرت خواہ ہیں -

۵- ''جس وقت یہ دیوان نقل کیا گیا (ق ۱۸۲۶ء) اس وقت مرزا ابتدائی کلام پر نظر ثانی کر رہے تھے - چنانچہ کئی پرانی غزلوں کے نئے تتمے نسخۂ شیرانی کے متن میں موجود ہیں - لیکن دیوان ریختہ کے انتخاب کی نوبت ابھی تک نہ آئی تھی - مرزا غالب نے ایک خط میں حکیم احسن اللہ خاں کو دیوان ریختہ کا فارسی دیباچہ بھیجنے کا ذکر کیا ہے - حالی کا بیان ہے کہ یہ خط کلکتہ سے لکھا گیا اور خط کی عبارت سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے - اگر یہ خط موجودہ منتخب دیوان کے متعلق ہے - تو شاید یہ نتیجہ اخذ کرنا بے جا نہ ہو کہ اردو دیوان کا انتخاب قیام کلکتہ کے دوران میں ہوا - چونکہ گل رعنا میں بعض ایسے اشعار منتخب ہوئے ہیں جنھیں مرزا نے منتخب اردو دیوان سے خارج کر دیا' اس لیے قرین قیاس ہے کہ یہ انتخاب گل رعنا کی ترتیب کے بعد ہوا - عجب نہیں کہ گل رعنا کی ترتیب کے دوران میں مرزا کو منتخب اردو

دیوان مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا ہو،، (اکرام)

۶- ارمغان غالب، ناشر تاج آفس، بمبئی، صفحہ ۱۶ تا ۲۱

۷- ارمغان غالب (طباعت محولہ بالا) صفحہ ۱۸۱ فٹ نوٹ -

۸- آثار غالب (غالب نامہ جزو اول، طبع چہارم ؟) ناشر تاج آفس بمبئی، سنۂ اشاعت ندارد - صفحہ ۲۰۹ تا ۲۱۹ نیز حکیم فرزانہ (طبع پنجم ؟ غالب نامہ جزو ؟؟، لیکن آغاز کتاب میں لکھا ہے طبع اول ۱۹۵۷ع) صفحہ ۶۲، ۸۲، ۸۳- دونوں طباعتوں میں مذکورہ بالا عبارت بظاہر یکساں ہے اس لیے ایک ہی اقتباس یہاں درج کیا گیا ہے -

آثار غالب جزو اول از غالب نامہ، طبع بمبئی [سرورق کے اندر چوتھا ایڈیشن درج ہے سنۂ اشاعت قبل از ۱۹۴۷ع] صفحہ ۲۷ تا ۴۷ - حیات غالب (طبع اول، سنہ ندارد - عجیب نہیں کہ ۱۹۵۸ع یا ۱۹۵۹ع ہو) میں بھی مذکورہ عبارت سفر کلکتہ کی بعض مزید تفصیلات کے ساتھ، صفحہ ۴۷ تا ۷۶ -

۹- اس سلسلے میں تین باتیں قابل ذکر ہیں :

(الف) یہ فہرست جناب فضل الدین قریشی صاحب نے تیار کی تھی اور اسے ٹائپ بھی کیا - یہ کام حافظ صاحب کی نگرانی میں ہوا - فہرست ۳۲ ٹائپ شدہ صفحات پر مشتمل ہے -

(ب) ذخیرۂ شیرانی کی خرید کے سلسلے میں جو خط و کتابت ہوئی وہ بھی محفوظ ہے - فائل نمبر ۱۲۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹ - اکتوبر ۱۹۴۰ع میں پروفیسر محمد شفیع صاحب نے لائبریرین سے تحریراً دریافت کیا کہ آیا شیرانی صاحب کی کتابیں وصول کر لی گئی ہیں - جواباً لائبریرین نے اسی دن اطلاع دی کہ جملہ مخطوطات اور دو ہزار

پانچ سو چودہ مطبوعہ کتب وصول ہو گئی ہیں ، پانچ کتب ابھی شیرانی صاحب کے پاس ہیں جو ایک ہفتے کے اندر اندر مل جائیں گی - ۲۶ - دسمبر ۱۹۴۰ع کو لائبریرین نے ماتحت عملے کو ہدایت کی کہ وہ ذخیرۂ شیرانی کو ترتیب دیں ۳۰ - دسمبر کو ترتیب مکمل ہوئی ۔ - اکتوبر ۱۹۴۱ع تک ذخیرے کا رجسٹر میں اندراج نہیں ہوا تھا اور اس ذخیرے سے استفادے کی عام اجازت نہ تھی ۲۲ - مئی ۱۹۴۲ع کو مخطوطات کا اندراج داخلہ رجسٹر میں شروع ہوا - مطبوعات کے اندراج کا کام ۲۲ - اگست ۱۹۴۲ع میں شروع ہوا - گویا اس وقت تک قلمی کتابیں رجسٹر داخلہ میں درج ہو چکی تھیں - [ان اطلاعات کے لیے میں جناب ملک احمد نواز صاحب کا ممنون ہوں] -

(ج) شیرانی صاحب کی کتب کی قیمت پر کچھ مخالفت بھی ہوئی تھی - پنجاب یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ کے ایک مباحثے کا اقتباس ذیل میں پیش کیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہوگا اس نادر ذخیرے کا استقبال کس انداز میں ہوا :

"Mr. Mihr Chand Mahajan said that Professor Shairani, after the age of 55 was given extention for two years after which, though the post was advertised, he was reappointed for a period of 2 years. Then he was again given two small extentions. After his retirement he applied for furlough. The Syndicate was recommending it with retrospective effect. This appeared a strange way of doing things. There was another item on the agenda of a loan of Rs. 8,500/- to Mr. Shairani against his collections. He wanted to know the reasons for these favours

to Mr. Shairani. Had the University spare money to throw away? He desired his protest to be recorded."

[III. Proceedings of a special Meeting of the Syndicate of the Uneversity of tne Panjab held in the Haily Hall, Lahore on Friday, the 27th of June1941, at 5 p.m. Page 3.]

۱۰ ، ۱۱- دیوان غالب کے دو نسخے - مقالہ از قاضی عبدالودود در معاصر (پٹنہ) حصہ ۱۲ صفحہ ۱ - ۱۳

۱۲- کسی اور شخص نے اگر "ش" پر کچھ لکھا ہے تو وہ میری نظر سے نہیں گزرا مگر اس کی مجھے خبر ھے کہ اس کے وجود سے غالب شناس واقف ھیں (حاشیہ قاضی عبدالودود) -

۱۳- "ن" میں دوسرا مصرع بجنسہ ہے اور پہلا یوں :

لئے جاتی ھے کہیں ایک توقع غالب

(حاشیہ قاصی عبدالودود)

۱۴- ایضاً مقالۂ ودود صفحہ ۱۳ ، ۱۴ ، ۱۵ ، ۱۶ ، ۴۷ -

۱۵- اس نسخے کی اشاعت کو اوائل ۱۹۵۹ع میں تصور کرنا چاھئے - دیباچے کے آخر میں یکم دسمبر ۱۹۵۸ع درج ہے جس کا مطلب یہ ھے کہ جلد بندی کے بعد نسخہ اوائل ۱۹۵۹ع ھی میں مارکیٹ میں آیا ھو گا -

۱۶ - ملاحظہ ھو دیباچۂ مذکور کے آخر میں تشکر کی تفصیل -

۱۷- [نذر غالب - صفحہ ۳۸ ، سطر ۱۴] دیوان غالب نسخہ عرشی صفحہ ۱۸ تا ۲۱

عرشی صاحب نے نسخہ حمیدیہ کے بارے میں صحیفہ غالب نمبر حصہ دوم کے لیے جو مقالہ ارسال کیا ہے اس میں اسی مقام پر مندرجہ ذیل عبارت کا اضافہ کیا گیا ہے :

"اسی لیے اس کے باوجود کہ اس کا انداز حک و اصلاح بالعموم بخط مصنف ھوا کرتا ھے اور اندرون کلام میں قلمزدگی و اصلاح

خود مرزا صاحب کے قلم سے ہونی چاہیے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بد نما خط کے اندراجات بخط غالب نہیں ہیں"۔

۱۸- دیوان غالب اردو ۔ نسخۂ عرشی ۔ ص ۵۷ تا ۸۲

۱۹- "دیوان غالب نسخۂ عرشی" ۔ از مالک رام ۔ رسالہ فکر و نظر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جنوری ۱۹۶۱ ع ص ۱۳۶ - ۱۳۷

۲۰- رسالہ فکر و نظر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (مقالہ "دیوان غالب نسخۂ عرشی" از مالک رام صفحہ ۱۳۹ تا ۱۴۴ -

۲۱- مقالہ "دیوان غالب اردو (نسخۂ عرشی)" امتیاز علی عرشی نقوش نومبر ۱۹۶۴ ع، ص ۱۷۴ سے ۱۷۷ تک -

۲۲- 'نذر ذاکر' بھارت کے صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کو ان کی اکہترویں سالگرہ کے موقع پر پیش کیا گیا ایک مجموعۂ مقالات ہے جس میں مختلف ادبا کے مقالے درج ہیں - کتاب دو جلدوں میں ہے، ایک جلد اردو کی اور دوسری انگریزی کی - مرتب مجلس نذر ذاکر، سال اشاعت ۱۹۶۸ء

۲۳- دیوان غالب (نسخۂ عرشی) صفحہ ۲۰ (دیباچہ) [حاشیۂ مالک رام]

۲۴- گل رعنا، غالب کا گمشدہ انتخاب کلام، مقالہ مالک رام در نذر ذاکر (۱۹۶۸ع) صفحہ ۵ تا ۷

۲۵- رسالۂ مذکور، طبع نومبر دسمبر ۱۹۶۸ع صفحہ ۴۴ -

۲۶- معاصر مطبوعہ ایڈیشن یہ ہیں :

(۱) طبع اول سیدالمطابع، شعبان ۱۲۵۷ھ / اکتوبر ۱۸۴۱ ع

(۲) طبع دوم، مطبع دارالسلام حوض قاضی، دھلی، ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ع

(۳) طبع سوم ، مطبع احمدی شاہدرہ ۲۰ محرم ۱۲۷۸ھ / جولائی ۱۸۶۱ع
(۴) طبع چہارم ، مطبع نظامی کانپور ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ / جون ۱۸۶۲ع
(۵) طبع پنجم ، نگارستان سخن میں شامل ، مطبع احمدی شاہدرہ ، دھلی ۲۷ صفر ۱۲۷۹ھ / اگست ۱۸۶۲ع
(۶) طبع ششم ، مطبع مفید خلائق آگرہ (کتابت ۱۸۶۱ ع طباعت ۱۸۶۳) ۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۳ء

۲۷- گل رعنا پر مالک رام صاحب کے مندرجہ مقالے اہم ہیں :

(۱) حصۂ فارسی پر "افکار" کراچی کا غالب نمبر ، سال ۲۱ شمارہ ۱۷۴ ، ۱۷۵ - فروری مارچ ۱۹۶۶ع صفحہ ۱۴۹ ببعد بعنوان گل رعنا - - - [یہ مقالہ مذکور کی اشاعت ثانی ہے - وحید]
(۲) حصۂ اردو پر ، نذر ذاکر ، طبع دھلی ، ۱۹۶۸ع - صفحہ ۳۹۷ - ۴۲۰ -
مقالہ بعنوان " گل رعنا ، — غالب کا گمشدہ انتخاب "

اس کے بارے میں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ گل رعنا کے کچھ اوراق حسرت موھانی مرحوم کے پاس تھے جو ان کی وفات پر معدوم ہو گئے - یہ اطلاع بھی اہم ہے کہ لاھور میں حکیم احمد نبی خاں صاحب (اجمل دوا خانہ) کے پاس بھی گل رعنا کا ایک قلمی نسخہ ہے- اس اطلاع کے بعد اب گل رعنا کے دو نسخے معلوم ہیں -

۲۸- مقالۂ عرشی بعنوان "دیوان غالب اردو کا ایک اور نادر مخطوطہ" ، در نقوش لاھور ، شمارہ ۸۱ ، ۸۲ جون ۱۹۶۰ع صفحہ ۵ تا ۱۱ -

۲۹- مقالۂ خلیل الرحمن داؤدی بعنوان "دیوان غالب اردو -

ایک نادر مخطوطہ" در ماہ نو کراچی غالب نمبر فروری ۱۹۵۹ع صفحہ ۱۲، ۱۳ - اس میں ترقیمے کا عکس بھی درج ہے - یہ نسخہ پہلے داؤدی صاحب کی ملکیت تھا اور اب کراچی میں ہے -

۳۰- مقالہ (ڈاکٹر) سید عبد اللہ بعنوان "دیوان غالب کا ایک نادر قلمی نسخہ" در ماہ نو، کراچی، شمارہ جولائی ۱۹۵۴ع نیز یہی مقالہ در "چند نئے اور پرانے شاعر" (ڈاکٹر سید عبد اللہ) لاہور ۱۹۶۵ع صفحہ ۵۵ تا صفحہ ۶۶ -

۳۱- ملاحظہ ہو عکس ترقیمہ نوشتہ غالب در دیوان غالب مرتبہ آغا محمد طاہر، طبع ۱۹۳۶ع -

۳۲- غالب کی زندگی میں طبع شدہ دیوان اردو (دیوان متداول) کی اشاعتوں کے سلسلے میں مندرجہ ذیل مقالات سے رجوع کیا جائے:

(۱) مقالہ مذکور الصدر در حاشیہ ۲۸

(۲) خلیل الرحمن داؤدی بعنوان "غالب اور محققین غالب" در روز نامہ امروز کراچی قسط اول ۱۵ فروری ۱۹۵۹ع قسط دوم ۱۶ فروری ۱۹۵۹ع -

(۳) خواجہ احمد فاروقی بعنوان "غالب کا اردو دیوان -- غالب کا تصحیح کیا ہوا" در آجکل، دہلی، دسمبر ۱۹۵۲ع صفحہ ۱۷ تا ۱۹ -

(۴) ڈاکٹر شوکت سبزواری بعنوان "غالب کے اردو کلام کی اشاعت" در ماہ نو کراچی فروری ۱۹۵۴ع. صفحہ ۱۱ تا ۱۳ و ۴۳ یہی مقالہ در "غالب - فکر و فن" (ڈاکٹر شوکت سبزواری) کراچی ۱۹۶۱ع صفحہ ۲۴۴ تا ۲۶۰

(۵) عطا کاکوی بعنوان "نگارستان سخن" در معارف دسمبر ۱۹۵۶ع (یہی مقالہ در "تحقیقی مطالعے") اس کے علاوہ عطا کاکوی "غالب کے اردو دیوان کی

اشاعتیں -- خود غالب کی زندگی میں"۔ در آجکل دھلی، فروری ۱۹۵۷ع صفحہ ۲۷ تا ۲۸ (نیز یہی مقالہ در "تحقیقی مطالعے" (عطا کاکوی) پٹنہ ستمبر ۱۹۶۵ع صفحہ ۳۳ تا ۳۹)۔

(٦) تحسین سروری "دیوان غالب کی چوتھی اشاعت کا مسودہ" در ماہ نو کراچی فروری ۱۹۶۶ع صفحہ ۷۰ تا صفحہ ۷۵۔

۳۳۔ ڈاکٹر بجنوری کی تحریر کا عکس، در محاسن کلام غالب طبع چہارم لکھنؤ مئی ۱۹۵۲ع مابین صفحہ ۱۶، ۱۷۔ [نیز دیکھیے مقالہ ڈاکٹر احمد لاری بعنوان ڈاکٹر بجنوری اور تدوین دواوین غالب در قومی زبان (کراچی) فروری ۱۹۷۱ع ص ۳۷ بعد جس میں یہ خط بھی شامل کیا گیا ھے اور مکتوب الیہ کا نام اور دیگر متعلقہ معلومات بھی درج ھیں]۔

۳۴۔ دیوان غالب (نسخۂ عرشی) صفحہ ۳۹۲

۳۵۔ صحیفہ غالب نمبر حصہ اول (مرتب وحید قریشی) جنوری ۱۹۶۹ع صفحہ ۱۲۸ در مقالہ عتیق صدیقی۔ بعنوان "غالب پر ابوالکلام آزاد کا ایک مقالہ" نیز دیکھیے ایضاً صفحہ ۱۳۰

۳۶۔ طالب ۱۸۸۵ع میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر مقرر ھوئے اور انھوں نے ۱۸۸۵ع میں اپنے والد نیر رخشاں کے انتقال پر ملازمت سے استعفیٰ دے کر دھلی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ تلامذۂ غالب صفحہ ۱۹۹۔

۳۷۔ یہ قطعی طور پر غالب کی ھے راقم نے اپنے مقالے تلامذہ غالب میں اس غزل کی نشان دھی گلدستۂ انجمن سے جو مطبع اکبری (دھلی ؟) سے ۱۲۸۴ھ میں شائع ھوا تھا، کی تھی۔ اس میں غالب کے اس سال میں شریک مشاعرہ ھو کر اس غزل کے پڑھنے کا ذکر

اور پوری غزل درج ہے [عرشی صاحب کے مرتبہ دیوان میں غزل الہلال کے حوالے سے درج ہے (حواشی میں طاہر ایڈیشن کا حوالہ ھے) گلدستے میں اس غزل کا ایک شعر زائد ہے -- وحید]

۳۸- نسخہ حمیدیہ - نوٹ از مفتی محمد انوارالحق صفحہ ۲۵ پر عبارت مبہم ھے جو مطلب میں سمجھ سکا ہوں اوپر درج ہے -

۳۹- فروغ اردو - غالب نمبر صفحہ ۴۲ بیعد لیکن ان کی بیان کردہ روایات، جن میں نسخے کی کتابت کا واقعہ اور دیگر امور درج ہیں محل نظر ہیں، البتہ اس کا قومی امکان ھے کہ فوجدار خان کا کتب خانہ ان کے صاحب زادے یار محمد خان شوکت کے انتقال پر (۱۹۱۲ع) نواب سلطان جہاں بیگم کے عہد میں ذخیرۂ کتب کو محل میں منگوا لیا گیا ہو - اور پھر بعد میں اسے حمیدیہ لائبریری (اب اس کا نام سینٹرل لائبریری ہے) میں دے دیا گیا ہو -

۴۰- جناب مالک رام اس اجلاس کی تاریخ ۲۳- اکتوبر ۱۹۳۸ع بتاتے ہیں (فکر و نظر - جنوری ۱۹۶۱ع صفحہ ۱۵۶) لیکن عرشی صاحب اجلاس کی تاریخیں ۱۹، ۲۰، ۲۱ - جنوری ۱۹۴۴ع بیان فرماتے ہیں اور یہی بیان مرجح ھے -

۴۱- ایک روایت ہے کہ مخطوطہ ڈاکٹر بجنوری مرحوم کے ہاں سے واپس نہیں آیا (مقالہ "غالب اور بھوپال" از ڈاکٹر گیان چند در رسالہ اردوے معلی شمارۂ اول غالب نمبر ۱۹۶۰ع صفحہ ۹۴) دوسری روایت یہ ھے کہ مخطوطہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق لے گئے (ایضاً صفحہ ۹۴) تیسری روایت ہے کہ پٹنہ کی خدا بخش لائبریری میں ڈاکٹر بجنوری کے ہاتھوں پہنچ گیا (مقالہ نسخہ حمیدیہ اور میاں فوجدار خاں از نادم سیتا پوری در فروغ اردو، غالب نمبر نومبر، دسمبر ۱۹۶۸ع صفحہ ۴۹) -

۴۲- جناب مالک رام نسخۂ عرشی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ نسخۂ بھوپال کے حاشیوں پر اصلاحیں اور اضافے

غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نہیں ہیں - ان میں سے پیشتر اضافوں کا خط غالب کے خط سے بالکل نہیں ملتا - یہ اضافے کسی اور شخص کے ہاتھ کے ہیں -

۴۳- قاضی صاحب نے اس موقع پر 'چند سال' کا لفظ استعمال کیا ہے چند کا اطلاق ۳ سے ۹ تک کی مدت کے لئے ہے اس لیے ہم نے عرشی صاحب کے بیان ۱۹۴۴ع اور قاضی صاحب کے دو چار برس کے ارشاد کو یعنی ۱۹۵۴ع میں نسخے کی گمشدگی کو محصور کر دیا ہے -

۴۴- ان کا اشارہ غالب کے اس مقطعے کی غزل کے بارے میں ہے :

طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا　　　اسداللہ خاں قیامت ہے

نسخہ حمیدیہ کے مرتب نے اسے اپنے محررہ دیباچے میں درج کیا ہے (دیکھیے صفحہ ۱۴) اور غالب کے ایک خط سے ماخوذ ہے -

۴۵- عمدۂ منتخبہ مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ، طبع دھلی ۱۹۶۱ء ص ۱۱۶ قلابین کی عبارت میرا اضافہ ہے اور قیاسی ہے -

۴۶- تلامذۂ غالب - مالک رام ، صفحہ ۱۳۷

۴۷- حیات غالب ، صفحہ ۲۵

۴۸- ذکر غالب - مالک رام- صفحہ ۳۲ حیات غالب - اکرام صفحہ ۲۵

۴۹- ایضاً بحوالہ مکتوب غالب بنام علائی در اردوے معلیٰ -

۵۰- نسخۂ شیرانی ۶۵ ب ، متداول دیوان میں مقطع یوں ہے :

عشق نے غالب ابھی پکڑا نہ تھا الفت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوق خواری ھائے ھائے

۵۱- ذکر غالب صفحہ متعلقہ

۵۲- دیباچۂ عمدہ منتخبہ ، صفحہ V

۵۳- ایضاً صفحہ ۱۰

۵۴- مجموعۂ نغز (مرتبہ حافظ محمود شیرانی) طبع لاہور، جلد اول، صفحہ ۵۹ -

۵۵- ایضاً جلد دوم، صفحہ ۳۷۵

۵۶- یہ دو غزلیں نسخۂ امروہہ میں موجود ہیں:

جگر سے ٹوٹے ہوئے مو کی ہے سناں پیدا
دہان زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا
ماہ نو ہوں کہ فلک عجز سکھاتا ہے مجھے
عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سلاتا ہے مجھے

۵۷- عیار الشعراء خوب چند ذکا - نقل نسخۂ انڈیا آفس مملوکہ راقم صفحہ ۱۶۷

۵۸- حیات غالب، صفحہ ۲۵

۵۹- دیکھیے مخطوطہ مملوکہ راقم صفحہ ۱ - نیز رسالہ نگار تذکروں کا تذکرہ نمبر صفحہ متعلقہ -

۶۰- دیباچۂ عمدۂ منتخبہ صفحہ XII در ذیل عیار الشعراء

۶۱- نسخۂ امروہہ کی روشنی میں ۱۳ غزلیں خارج شدہ معلوم ہوتی ہیں -

۶۲- تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، نسخۂ حمیدیہ، دیباچہ صفحہ ۷ -

۶۳- یہ تفصیلات غالب از مہر صفحہ ۷، حیات غالب از اکرام صفحہ ۱۱، اور ذکر غالب از مالک رام صفحات متعلقہ سے ماخوذ ہیں -

۶۴- یہ غالب کا بیان ہے اور اس کی براہ راست تصدیق کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہیں -

۶۵- غالب کی پنشن ساڑھے سات سو روپے سالانہ بیٹھتی تھی -

۶۶- غالب از مہر صفحہ ۶۱

۶۷- ایضاً صفحہ ۶۳

۶۸- ایضاً صفحہ ۶۶

۶۹- ایضاً صفحہ ۷۳

۷۰- دیکھیے ذکرِ غالب صفحہ ۴۲ حاشیہ جہاں غالب کی تحریروں کے استدلال کیا گیا ہے۔

۷۱- ایضاً صفحہ ۴۲، ۴۳

۷۲- غالب از مہر صفحہ ۸۳

۷۳- دیوان غالب نسخۂ عرشی دیباچہ صفحہ ۴۴

۷۴- حیات غالب - اکرام، صفحہ ۱۷ تا ۴۷

۷۵- متفرقات غالب - مرتبہ مسعود حسن رضوی، طبع رامپور، ۱۹۴۷ع صفحہ ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲

۷۶- تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے عبدالرزاق عظیم کا تحقیقی مقالۂ شاہ نصیر صفحات متعلقہ۔

۷۷- کلیات نثر فارسی، مکتوب بنام ناسخ، صفحہ ۱۶۱

۷۸- کلیات نثر غالب (طبع ۱۲۸۷ھ نول کشور پریس) مکتوب بنام میر اعظم علی مدرس اکبرآباد صفحہ ۱۰۳، ۱۰۴ -

۷۹- متفرقات غالب میں بھی یہ خط صفحہ ۲۳، ۲۴ پر ہے اس میں اس مقام پر ''ہندوستان'' کا لفظ بھی ہے -

۸۰- کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۴۶

۸۱- ذکر غالب صفحہ ۴۵

۸۲- دیوان غالب نسخۂ عرشی صفحہ ۱۲۱

۸۳- ماثر غالب، مرتبہ قاضی عبدالودود (در علی گڑھ میگزین غالب نمبر) صفحہ ۲۴

۸۴- محولہ بالا مقالہ قاضی عبدالودود در معاصر -

۸۵- غالب از مہر صفحہ ۳۵۹

۸۶- نسخہ شیرانی میں ردیف "ے" کے آخری ورق نہیں ہیں - جن غزلوں کے محاذ میں غلط " لکھا ہے ان کو چھوڑ کر باقی کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ نسخہ شیرانی میں شامل ہیں یا نہیں بہت مشکل ہے -

۸۷- نسخہ شیرانی میں بعض اوراق افتادہ ہیں - ردیف الف میں "بے وفائی ' کا پارسائی کا" والی غزل (صفحہ ۱۷) کے حاشیے پر ترک ' گر نہ ' ہے یہاں سے کم از کم ایک ورق افتادہ ہے - اس کے بعد صفحہ ۳۶ ب و ۳۷ کے مابین ایک ورق یا کچھ زائد اوراق افتادہ ہیں - اس مقام پر نسخہ حمیدیہ کے مطلعے پیش کیے جاتے ہیں - یہ کہنا مشکل ہے کہ پہلی اور آخری غزل کے سوا اور کون کون سی غزل نسخہ شیرانی میں شامل تھی :

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ (۹ شعر)

اس کا "ترک ' نسخہ شیرانی میں ہے اس لیے یہ غزل یا اس کے کچھ اشعار نسخہ شیرانی میں ضرور تھے ۔

ردیف ح

دعویٰ عشق بتاں سے بگلستان گل و صبح
ہیں رقیبانہ بہم دست و گریبان گل و صبح (۵ شعر)

ردیف د

بسکہ وہ پاکوبیان در پردۂ وحشت ہیں یاد
ہے غلاف غنچۂ خورشید ہر یک گرد باد (۵ شعر)

تو پست فطرت اور خیال بسا بلند
اے طفل خود معاملہ قد سے عصا بلند (۷ شعر)

حسرت دستگه و پائے تحمل تا چند
رگ گردن خط پیمانهٔ بے مل تا چند (۹ شعر)

به کام دل کریں کس طرح گم رهاں فریاد
هوئی هے لغزش پا لکنت زباں فریاد (۷ شعر)]

اس غزل کے آخری پانچ شعر نسخهٔ شیرانی کے اگلے ورق پر موجود هیں - شروع کے دو کے شعر (بشمول مطلع) بھی هوں تو عجب نہیں -

۸۸- غالب از مہر صفحه ۲۹۵

۸۹- آب حیات - آزاد - طبع چہاردهم ، صفحه ۵۰۹

۹۰- تلامذهٔ غالب - مالک رام ، صفحه ۲۸۷

۹۱- نیز رخشاں کے حالات کے لیے دیکھیے مکاتیب غالب مرتبه عرشی طبع ۱۹۳۷ صفحه ۹۷ فٹ نوٹ ، خطوط غالب مرتبه غلام رسول مہر طبع دوم صفحه ۱۴ تا ۴۷ جلوه صحیفهٔ زرین ، نیر رخشاں - مرتبه سید احمد خاں طالب طبع ۱۹۱۶ع دیباچه صفحه ۲ تا ۴ -

۹۲- تلامذهٔ غالب ، مالک رام ، صفحه ۱۳۵

۹۳- حسین میرزا کے حالات کے لیے دیکھیے خطوط غالب (مہر) صفحه ۳۸۴ تا ۳۸۶ - واقعات دارالحکومت دهلی (بشیرالدین) جلد سوم ، صفحه ۶۷ تا ۷۲ - خمخانهٔ جاوید ، جلد چہارم ، صفحه ۸۲ تا ۸۴ - بہادر شاه کا روزنامچه (حسن نظامی) صفحه ۳۵—۳۶ ، ۶۷—۶۸ ، ۷۵—۷۶ ، ۷۹—۸۰ ، ۸۳ ، ۱۰۵—۱۰۶ ، ۱۲۸ - حیات غالب (اکرام) صفحه ۱۶۸—۱۶۹ - نادرات غالب (آفاق) ، طبع کراچی ۱۹۴۹ء ، صفحه ۱۵۸ -

———

تلامذۂ غالب

پنجاب یونیورسٹی کے دو گلدستے

پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے شعبۂ اُردو میں ایک مجموعہ ۳۱۰۶-۸۹۱ف ۳۳۹ پر درج ہے۔ یہ مجلد کئی مطبوعہ کتابوں پر مشتمل ہے۔ "مشاعرۂ دہلی"، "گلدستۂ انجمن"، "مجمع اللطائف" "قصیدہ مدح ولیم جارج ڈیوس کمشنر، مؤلف حرف بلدیوسنگھ میونسپل کمشنر دہلی متخلص بہ نامی کے مکتوبات مصطفائی، مختصراحوال مصنفان ہندی تذکروں کا "سکنتلا ناٹک" شکرستان خیال" (حاشیے بر خوان نعمت قاسم خانی) اور "انشائے بہارِ بے خزاں" اس میں شامل ہیں۔ مجموعے کے دو گلدستے، غالبیات سے تعلق رکھنے والے احباب کے لیے اہمیت رکھتے ہیں۔ اس لیے "مشاعرۂ دہلی" اور "گلدستۂ انجمن" کا تفصیلی تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

(۱)

"مشاعرۂ دہلی" جس پر لائبریری والوں کو فرحت اللہ بیگ کے "دلی کا آخری یادگار مشاعرہ" (یا "شمع دہلی") کا شبہہ ہوا ہے، در اصل فرحت اللہ بیگ سے کچھ علاقہ نہیں رکھتا۔ یہ رسالہ تیس صفحات پر مشتمل ہے۔ آخری دو صفحے خالی چھوڑے گئے ہیں۔ اس طرح صفحات ۳۲ ہو گئے ہیں۔ پہلے صفحات کی عبارت یہ ہے۔

کلام الشعراء سحر العقلاء

"بفضل ایزد منان دریں زمان فرخی توامان مجموعہ نظام شاعران جادو بیان موسوم مشاعرہ دہلی ۱۲۹۰ھ

حسب فرمائش جناب معلی القاب نواب مرزا احمد سعید خاں صاحب طالب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ضلع فیروزپور مطبع صادق الانوار بہاولپور میں باہتمام حافظ عبدالقدوس قدسی ایڈیٹر کے چھپا۔"

خاتمے پر یہ عبارت درج ہے:

"عبدالقدوس قدسی۔ سپرنٹنڈنٹ مطبع صادق انوار بہاولپور بہ افسوس عرض کرتا ہے کہ اس رسالہ کی ایام ترتیب ہی میں حسب ضرورت شاہجہاں آباد تک چلا گیا تھا میری غیبت میں کارپردازان مطبع سے دو تین غزلیات کی کتابت میں بے ترتیبی ہو گئی۔ اب بڑی منت سے معافی کا خواستگار ہوں۔ جناب مستطاب مولانا نواب احمد سعید خاں صاحب بہادر طالب اسسٹنٹ کمشنر، ضلع فیروز پور، اپنے ارادتمند صمیم کا یہ بڑا قصور معاف فرمائیں۔"

اس طرح مشاعرے میں جن شعراء کی غزلیں شامل ہیں ان کے اسماء گرامی یہ ہیں:

احسان الٰہی احسان خلف منشی محمود رونق، میاں امانؔ سوداگر دہلی امانت، مرزا بہاؤالدین احمد خاں باطل خلف نواب شہاب الدین احمد خان ثاقب مرحوم، پیر قمرالدین المتخلص بہ پیرجی، مرزا شجاع الدین احمد خاں تاباں خلف نواب شہاب الدین احمد خاں صاحب ثاقب مرحوم، حافظ عبدالرزاق حافظ، حسرت (نامعلوم الاسم)، محمد اسماعیل خاں ذبیح، منشی محمود رونق، سراج الدین احمد سائل خلف نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب، فضل متین سوزش پٹیالوی، سید اکبر مرزا سید، مرزا محمد حسین خاں

(میر مشاعرہ) شرر خلف مرزا غلام حسن ممو، قاضی قربان علی شیدا، محمد مرزا خاں عابد خلف مرزا تاباں علی بیگ سالک، محمد ابراہیم خاں فائق، مرزا علی قیس، حافظ عبدالقدوس قدسی، نادر علی شاہ سیفی، منشی غلام احمد صادق، سردار محمد خاں کیفی، مرزا ممتازالدین احمد خاں مائل خلف نواب شہاب‌الدین احمد خاں ثاقب مرحوم، حافظ دستگیر مبین، نور الٰہی سوداگر دہلی متخلص بہ نورالٰہی، مولوی عبدالغفور صاحب اہل پورب متخلص بہ نیر، مرزا امیرالدین احمد خاں فرخ خلف نواب علاؤالدین خاں علائی رئیس لوہارو، حضرت مولانا مصاح (رحمت اللہ علیہ)، ہمعنان غالب جناب مولانا سعید احمد خاں صاحب طالب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر فیروز پور خلف نواب ضیاءالدین احمد خاں صاحب بہادر نیر رخشاں رئیس لوہارو متوطن دہلی -

اس فہرست میں غالب کے شاگردوں میں سے قمرالدین دہلوی المتخلص بہ پیرجی اور مرزاسعیدالدین احمد خاں طالب نے دلی کے مشاعرے میں شرکت کی - یہ مشاعرہ ۱۲۹۷ ہجری میں ہوا - اس کے ایک برس بعد (۱۲۹۸ھ) ہی قمرالدین پیرجی نے انتقال کیا (تلامذۂ غالب مالک رام - صفحہ ۵۸) اس لحاظ سے عجب نہیں اگر یہ آخری مشاعرہ ہو جس میں پیرجی نے شرکت کی - نیر رخشاں کے فرزند مرزا سعیدالدین احمد خاں عرف نواب سعید احمد خاں طالب، ۱۸۷۵ء میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر مقرر ہوئے اور انہوں نے ۱۸۸۰ء میں اپنے والد نواب ضیاءالدین احمد خاں کے انتقال پر، عہدے سے استعفیٰ دے کر دلی میں سکونت اختیار کی - ان کا انتقال یکم ستمبر ۱۹۲۵ء مطابق ۴ ذی الحجہ ۱۳۳۷ ہجری کو ہوا (تلامذۂ غالب صفحہ ۱۹۹) مرزا سعیدالدین

احمد خاں کا کلام ہنوز قلمی صورت میں کتب خانہ رضائیہ رامپور میں محفوظ ہے اور زیور طبع سے آراستہ نہیں۔ اس لیے اس گلدستے کی درج شدہ غزلیں ایک گونہ تاریخی اہمیت رکھتی ہیں۔

* * *

غزل پیر قمرالدین المتخلص بہ پیر جی

بیاں کیوں کر ہو دکھ مجھ سے ستمگر سوز پنہاں کا
کہ تیرے ہجر میں کیا حال ہے میرے دل و جاں کا

مجھے جمعیت کونین حاصل سر بسر ہوتی
اگر پابند ہوتا آپ کی زلف پریشاں کا

مرے گریہ کے طوفاں نے ڈبویا خانۂ دشمن
نہ ہوں ممنون کیوں کر اپنے جوش چشم گریاں کا

ترے روئے منور کی وہ تابش ہے کہ اے جاناں
مقابل ہو سکے، منہ یہ کہاں مہر درخشاں

ہوئے جو تارک دنیا ملی ہے عشق کی دولت
نہیں اے ہمدمو یہ کام ہر اک فرد انساں کا

رہ و رسم محبت سے خبر تم کو نہیں اصلا
ٹھکانا زاہدو! کیا ہے تمھارے دین و ایماں کا

کیا وعدہ بھی آنے کا اگر اُس نے خدا شاہد
یقیں ہم کو نہیں ہمدم کسی کے عہد و پیماں کا

اُٹھائے گر نقاب اپنے رخ پر نور سے جاناں
بسنتی رنگ ہو جائے حیا سے ماہ تاباں کا

ملا کر آنکھ چھینا اہل عالم کا دل خودبیں
لقب ہو دل ربا کیوں کر نہ تیرے چشم فتاں کا

نہ کیوں کر رنگ و بو پھولوں کی نقش آب ہو ہمدم
کہ طرہ کھل گیا ہے آج پھر اس سنبلستاں کا

تجھے کیوں پیر جی روز جزا کا ڈر ہے عصیاں سے
شفاعت کو ہے کافی واسطہ شاہ رسولاں کا

* *

غزل ہمعنان غالب جناب مولوی احمد خان صاحب طالب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر فیروزپور خلف نواب ضیاءالدین احمد خان صاحب بہادر نیر رخشاں رئیس لوہارو متوطن دھلی :

وہ سوز عشق سے لکھا ہے مطلع میں نے دیواں کا
کہ آتش نے مرے مطلب نکالا ابن عمراں کا

ابھی صرف اس قدر ہم نے لیا ہے بوجھ عصیاں کا
کہ اندیشہ ہوا ہے داور محشر کو میزاں کا

سمند عمر تھک کر رہ گیا اور دور ہے منزل
نہ پوچھو وسعت عرصہ مرے دشت و بیاباں کا

عرق آیا جو گرمی سے کسی کے سبزۂ خط پر
نگاہ مہر نے دیکھا تماشا شبنمستاں کا ۔

وہ اکثر ملی نگاہیں مہر و الفت کی نہیں پاتا
اشارہ کچھ ہوا ساقی کو اس کی چشم فتاں کا

پھنسا جو اس کے پھندے میں وہ بھولا آشیانہ کو
عجب دلکش نشیمن دام ہے اس زلف پیچاں کا

جگر، پہلو، دل و سینہ میں ہے اک کشمکش پیدا
ہدف ہے کون سا کہہ دو تمھارے تیر مژگاں کا

جو تیرے پیرہن سے چھو گئے تو بھی نہ برہم ہو
بڑھی کچھ قدر مستی کی گھٹا رتبہ نہ داماں کا

ہمارا درد سن کر کاتب قدرت نے فی الجملہ
لکھا اوراق روز و شب پہ عالم چشم گریاں کا

جفا سے تیرے مثل سینہ شق ہے اے صنم وہ بھی
نشاں ہے شہر خاموشاں میں یہ گور غریباں کا

ہزاروں حسرتوں کا خون اس میں ہو گیا ہمدم
گماں کیوں کر نہ میرے دل پہ ہو گنج شہیداں کا

زباں کلک طعنہ زن ہوئی عقد ثریا سے
دم تحریر ذکر آیا جو اس کے سلک دنداں کا

جناں سے اور جہاں سے کبک وطوبیٰ کیوں نہ مٹ جائیں
کہ آیا ہے قدم دنیا میں اس سرو خراماں کا

ہلال تیغ ابرو پر تمھارے گر نظر پڑتی
زنان مصر کا سا حال ہوتا ماہ کنعاں کا

یہ رویا پھوٹ کر اس لالہ رو کے ہجر میں طالب
کہ ہر اک اشک دانہ بن گیا تسبیح مرجاں کا

غزل دوم

نہ پوچھو حال کچھ صاحب دلو مجھ سے دل و جاں کا
ہدف ہے وہ تو ابرو کا ، نشانہ ہے یہ مژگاں کا

الٰہی آج کس نے روزن دیوار سے جھانکا
کہ مجھ کو پاسباں بننا پڑا ہے اب، نگہباں کا

جنوں اور فصل گل؟ ہاتھ اب کوئی بے کار رہتے ہیں
رفو ہونا بہت مشکل ہے چاک جیب و داماں کا

ہمارے درد دل نے کی ہے سازش ان کے کاکل سے
نباہ اب کیوں کہ ہو، دیکھیں پریشاں سے پریشاں کا

جو رک رک کر مرے سینہ سے شعلے ضعف میں نکلے
تو عالم کو نظارہ ہو گیا سرو چراغاں کا

تبسم میں یہ کس غنچہ دہن کی میں ہوا کشتہ
کہ میرے ہر بن مو پر گماں ہے روے خنداں کا

یہ کس پان خوردہ لب کی چوٹ دل پر لگ گئی یا رب
کہ منہ زخم جگر کا قہقہہ ہے شمع خنداں کا

سمندر سے دل زخمی کو دھوؤں گا کہ تسکیں ہو
میں کیوں ممنون ہوں ناحق کسی کے اک نمکداں کا

اگر مل جائے مجھ کو اک بریدہ ناخن جاناں
تن لاغر سے تب بار گراں اترے گریباں کا

یہ غربت سے غریبوں کی ہوئی ہے چارہ‌سازی اب
کہ ریشہ خار وحشت کا بنا ہے زخم کاٹاں کا

کسی کے کعبۂ دل کی زیارت کو گیا ہو گا
شہادت خوں چکاں ہونا ہے تیرے تیر مژگاں کا

کسی کے زلف و عارض پر مرا دل مبتلا ہو گا
وگرنہ کیا سبب ہے خواب میں آنا گلستاں کا

ہمارا جذبۂ دل اک شہادت ہو گیا ورنہ
جہاں سے محو ہو جاتا فسانہ ماہ کنعاں کا

عدو کے ساتھ میرے سامنے آئینہ پھر دیکھو
تماشا دیکھنا ہے تم کو گر طوطی و حیران کا

ہوا ہے وہ بھی صید افگن کبھی دامن سے الجھوں گا
بنا دے کاش مجھ کو لاغری کانٹا مغیلاں کا

کسی کے کاکل مشکیں سے شاید ہمسری کی ہے
کہ منہ کالا جہاں میں ہو گیا ہے شام ہجراں کا

ہے جھونکا باد صر صر کا ترا ہر شعر اے طالب
کہ بزم شعرخوانی قطعہ ہے اک بید لرزاں کا

قطعہ

زمانہ کی حیا سے ہو گیا ہمراہ قاتل بھی
اٹھا جس دم جنازہ طالب مہجور جاناں کا

کسی نے اُس سے یوں پوچھا کہ کس کے ساتھ جاتے ہو
تو بولا ہے جنازہ ایک بے چارے مسلماں کا

(۲)

"گلدستہ انجمن" کے سر ورق کی عبارت یہ ہے -

اَنَّ الشعرَ الحکمۃً

بحمداللہ کہ بہارستان نظارگیان معنی رس
اعنی مسمیٰ "گلدستۂ انجمن" ۱۲۸۴ھ
مجموعہ غزلیات رونق افروزان بزم مشاعرہ
در مطبع اکبری واقع دہلی بہ محلہ چوری گراں برمکان سنبھو ناتھ -
باہتمام سیدظہیرالدین حسین طبع شد -

دیباچہ جو متن کے علاوہ حاشیوں میں بھی درج ہے یہ ہے :

"حلاوت کار شکریں گفتاران شیریں بیان اس کے فیضان بیاں ستائش سے رشک افزائے شیرینی ہو سکتی ہے کہ جن سے اپنے ظہور خالقیت اضداد کے لیے کام و زبان شیریں زبانان فصیح بیان کو نمک زار فصاحت کیا :

نظم

خالق باری کہ سخن آفرید
چیست سخن کام و دھن آفرید
نام سخن باقی و پاینده کرد
مرده دلاں را بسخن زنده کرد
لطف معانی بسخن ساز کرد
ناز بیاں را سر انداز کرد

جل‌جلالہٗ وعم‌نوالہٗ اور شور بازار فصیح بیانی سخن سنجان گزیدہ شعار اس کے فیضان چاشنی گیری نعت پاک سے شورش افزائے غیرت بے‌نمک سازی ملامت ملیحان عالم ممکن ہے کہ جن سے اپنی شیریں مقالی سے بازار فصیحان عرب و عجم یک قلم پھیکا کر دیا :

رباعی

یعنی وہ محمدؐ نبی مرسل
ہے جس کا سخن قول حق عزوجل
ہو اس پہ اور اس کی آل پر لاکھ درود
اور اس کے صحابہ پہ درود اکمل

چونکہ اس بحر بے پایاں و بے کنار کو انتہا و ساحل نہیں ۔
اس واسطے اس خیال محال سے عطف مناں (عناں؟) لازم و واجب ہوا۔
سخنوران والا نظر پر ہویدا ہو کہ یہ احقرالعباد خاکسار محمدعبدالکریم
ابتدائے عمر سے گلچین چمن فیض خدمت سخن گویان رنگیں مقال رہا
ہے اور گلبانگ شگفتہ بیانی سخن سوزوں کو ہمیشہ واسطۂ ابتسام
غنچۂ خاطر افسردہ جانتا ہے ۔ جو کلام عاشقانہ سراپا سوز و گداز
نظر آتا ہے دل مذاق منزل لطافت آشنا تڑپ جاتا ہے ، بالخصوص
کلام تازہ کے دیکھنے سے حلاوت بے اندازہ ملتی ہے اور جراحت
کہن دل بسمل ادا بندی سخن گفتار نو سے لطف بے قراری تازہ
پاتا ہے ۔ ہر چند اس زمانے میں علم و ہنر کی کسادبازاری ہے اور
نخل فضل و کمال کا ہنگام برگ ریزی ہے مگر پھر بھی جو کہ
صاحبان طبع رسا اور مذاق سخن سے آشنا ہیں ان کی محفل میں ایسے
ہی امور مذکور ہوتے ہیں ۔ چنانچہ مخدومی محمد اکرم‌اللہ خاں صاحب
خلف محمد شفیع خاں عرف منشی آغا جان صاحب مرحوم و مغفور
میر منشی رزیڈنٹی راجپوتانہ اور محمد احسان الرحمن خاں صاحب
خلف اصغر نواب سیف‌الرحمن خاں عرف موسیٰ خاں صاحب کہ
جسم دوستی کی جان آگاہ اور چشم خلائق کے نور نگاہ ہیں ، ازبسکہ
سنجیدہ و فہمیدہ و مظہر اوصاف حمیدہ ہیں ، اہل سخن کے جلسہ
صحبت کے راغب اور صاحب کمال کے ملنے کے طالب ، یہ تجویز
فرمائی کہ بیکاری میں عمر صرف کرنا اسراف ہے کوئی ، محفل احبا
قرار دینی چاہیے کہ جس میں سب سخندان جمع ہو کر داد شعر و
شاعری دیں اور علی‌الرغم زمانہ فارغ‌البالی میں پہر دوپہر بسر اوقات
کریں ، جو کہ اس امر کے واسطے کوئی تدبیر بہتر مشاعرہ سے
نہ تھی اس واسطے جناب موصوفین نے اپنے کاشانۂ ارم نشانہ میں
مہینہ میں دو بار جلسہ مشاعرہ مقرر فرمایا اور بار بزم آرائی اس

مجلس کا سخن سنج نکتہ پرور، نقاد جوہر خوش کلاسی، والا نظر مکرسی میر عبدالرحمن صاحب خلف اکبر میر حسین تسکین نے، کہ نسبت برادرزادگی اور شاگردی جناب حکیم مومن خاں مومن صاحب نوراللہ مرقدہ سے رکھتے ہیں، اپنے دوش ہمت پر اٹھایا۔ چونکہ میر صاحب موصوف اکابر شہر سے ہیں اور ان کا پاس خاطر رؤساے شہر کو بدل منظور ہے، ہر ایک صاحب محفل مشاعرہ میں تشریف لاتے ہیں۔ پہلے ہی جلسے میں وہ مشاعرہ غزل خوانی ہوا کہ ہنگام اختتام بزم مشاعرہ انتشار نور صبح ثانی ہوا، جو کہ بہ پاے بند وفاق مدت سے اس بات کا تھا کہ کوئی ایسا سبب ہو کہ ہر ایک سخن سنج کا کلام رنگیں اور نتائج طبع سحر آفریں ایک جگہ فراہم ہوتا ہے۔ اس کا دیکھنا سبب انشراح خاطر مشتاقان نزدیک و دور ہوا اور ہر جا شعر و شاعری کا مذکور ہوا۔ اس لیے یہ تدبیر کی گئی کہ ہر مشاعرہ کی غزلیں مجتمع ہو کر منطبع ہوں، تا کہ جو شایقین باتمکین آنے سے معذور یا اس شہر سے دور ہیں، وہ اس مجموعہ کو منگا کر اپنے دولت خانہ میں بیٹھے ہوئے محفل مشاعرہ ملاحظہ فرمائیں۔ از بس کہ اس تالیف میں احباب باصفا کا کلام ہے اس واسطے ''گلدستۂ انجمن'' اس کا نام ہے اور بہ نظر شکایت تقدیم و تاخیر بقید ردیف سب صاحبوں کے نام اور تخلص لکھے گئے اور ہر مشاعرہ کو ایک انجمن قرار دیا۔ واللہ موید الحصول المقصود و وصول المطلوب۔''

زیر نظر گلدستے کے بیس صفحات ہیں۔ بظاہر آخر کے کئی ورق افتادہ ہیں جن پر مشاعرہ ثانی کے بہت سے شعراء کا کلام اور طباعت کے خاتمے کا ذکر ہو گا۔ پہلے مشاعرے (انجمن اول) کا مصرع طرح:

ع یہ مدعی بغل میں چھپایا نہ جائے گا

اور دوسرے (انجمن دوئم) کا :

ع مرا درد مجھ کو دوا ہو گیا

* *

اس دوسرے مشاعرے میں غالب کی ایک غزل بھی شامل ہے جو غیر طرحی ہے۔ باقی درج شدہ شعراء کا کلام طرح میں ہے۔ شعراء کے نام مع القاب اور دیگر ضروری معلومات درج ہیں۔ غالب کے بارے میں تعارف یہ ہے :

"غزل جناب مستطاب نواب نجم الدولہ دبیرالملک اسداللہ خاں بہادر نظام جنگ المتخلص بہ غالب سلمہ اللہ تعالیٰ تبرکاً و تیمناً بقالب تحریر درآمد۔"

* *

غالب کے شاگردوں کے بارے میں ان کے القاب و آداب میں فن تذکرہ نگاری کے جملہ لوازم کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے :

(۱) 'سخن گستر بے مثل' نکتہ پرور بے بدل' جامع فروع و اصول' حاوی' معقول و منقول ، مولوی الطاف حسین حالی ' از شاگردان جناب نجم الدولہ مرزا اسداللہ خان صاحب غالب سلمہ اللہ تعالیٰ ' ازان اوست..."

(۲) "گوہر افشانی' بیان اعجاز تواماں' عالی مناصب والا مناقب' بہار افروز گلستان معانی' رونق بخش حدیقۂ سخن دانی ' نواب محمد علی خاں صاحب متخلص بہ رشکی' خلف اکبر جناب مستطاب نواب حاجی محمد مصطفیٰ خاں صاحب دام افضالہم' صاحب "تذکرۂ گلشن بے خار" شیفتۂ ریختہ و حسرتیؔ پارسی ' ارشد تلامذۂ جناب نجم الدولہ نواب اسداللہ خاں صاحب غالب سلمہ اللہ تعالیٰ"

(۳) ''نوک ریز خامۂ جادو رقم، شاعر بے مثال، نکتہ پرور بے عدیل، سالک مسالک سخن، مرزا قربان علی بیگ خان صاحب المتخلص بہ سالک، خلف اکبر نواب عالم بیگ خان صاحب، از اشرف تلامذۂ جناب نجم الدولہ مرزا اسداللہ خان صاحب غالب سلمہ اللہ تعالیٰ۔''

(۴) ''نخل بند گلستان معانی، گل نو رسیدۂ ریاض سخندانی، مرزا حسین علی خان صاحب متخلص بشاداں، خلف اصغر مرزا زین العابدین خان صاحب عارف مرحوم، نبیرۂ جناب افاضت مآب حضرت نجم الدولہ غالب سلمہ اللہ تعالیٰ - از آن اوست...''۔

(۵) ''متاع گران بہاے سخن، نقاد لالی آبدار معانی مضامین و جوہری، گوہر شاہوار معانیہاے رنگین، سلطان ذاکرین، مرزا یوسف علی خان صاحب عزیز، دہلوی مسکن، بنارسی مولد، صاحب دیوان - از اشرف تلامذۂ حضرت غالب سلمہ اللہ تعالیٰ۔''

(۶) ''طبع زاد شاعر خوش بیان، سخنور نکتہ داں، لالہ بہاری لال صاحب متخلص بہ مشتاق، شاگرد جناب مرزا اسداللہ خان صاحب غالب سلمہ اللہ تعالیٰ۔''

* *

(۷) ''شیریں گفتار یکتا، گوہر دریاے معانی، جوہری، جوہر سخن سنجی و سخن دانی، شاعر نغز گفتار، معجز بیان، مولوی محمد اسو جان صاحب متخلص بہ ولی، از شاگردان نجم الدولہ مرزا اسداللہ خان صاحب غالب سلمہ اللہ تعالیٰ[۹۹]''

غالب کی درج شدہ غزل وہی ہے جو دیوان غالب اُردو مرتبہ عرشی کے صفحہ ۳۰۳ پر درج ہے اور جس کی ردیف ''تکیہ'' ہے۔ جناب عرشی نے اسے الہلال کلکتہ کے ۲۲ جولائی ۱۹۱۴ء کے پرچے سے نقل کیا ہے[۲]۔ لیکن وہاں گیارہویں شعر کے بعد ایک شعر نہیں ہے۔ شعر یہ ہے:

جو بعد قتل مرا دشت میں مزار بنا
لگا کے بیٹھتے ہیں اس سے راہزن تکیہ

* *

تلامذۂ غالب میں سے مولوی الطاف حسین حالی، نواب محمد علی خاں رشکی، مرزا قربان علی بیگ سالک، مرزا حسین علی خاں شاداں، مرزا یوسف علی خاں عزیز، لالہ بہاری لال مشتاق اور مولوی محمد امو جان ولی شریک مشاعرہ تھے۔ مولانا الطاف حسین حالی متوفی ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء ۱۳ صفر ۱۳۳۳ ہجری کی طرحی غزل ان کے دیوان میں شامل ہے اور اُسے ۱۸۹۳ء کے پہلے ایڈیشن میں انہوں نے قدیم غزلوں میں شمار کیا ہے۔ دیوان میں اشعار کی ترتیب بدلی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ تین شعر بالکل حذف کر دئیے ہیں۔ (شعر نمبر ۷، ۹ اور ۱۲) شعر نمبر ۱۰ اور ۱۴ میں ترمیم کی گئی ہے۔ اس تغیر و تبدل کو واضح کرنے کے لیے ''گلدستے'' کی غزل کا متن اور دیوان حالی (طبع اول) کا متن ایک دوسرے کے بعد درج کیا جاتا ہے:

''گلدستۂ سخن'' حاشیہ نمبر ۷ متن ۸

○

۱۔ دل سے خیال دوست بھلایا نہ جائے گا
سینہ میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا

۲ - تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

۳ - اے دل رضائے غیر ہے شرط رضائے دوست
زنہار بار عشق اٹھایا نہ جائے گا

۴ - کیوں چھیڑتے ہو ذکر نہ ملنے کا رات کے
پوچھیں گے ہم سبب تو بتایا نہ جائے گا

۵ - راضی ہیں ہم کہ دوست سے ہے دشمنی مگر
دشمن کو ہم سے دوست بنایا نہ جائے گا

۶ - بگڑیں نہ بات بات پہ کیوں جانتے ہیں وہ
ہم وہ نہیں کہ ہم کو منایا نہ جائے گا

۷ - کچھ کچھ صعوبتیں تو وفا میں ہوئیں مگر
وہ نقش جم گیا کہ مٹایا نہ جائے گا

۸ - ملتا ہے آپ سے تو نہیں حصر غیر پر
کس کس سے اختلاط بڑھایا نہ جائے گا

۹ - ہاں التفات تم کو نہیں، سب پہ کھل گیا
کب تک نقاب رخ سے اٹھایا نہ جائے گا

۱۰ - دیکھیں ہیں ایسی ان کی بہت کج ادائیاں
آپ (اب؟) ہم سے منہ میں موت کےجایا نہ جائیگا

۱۱ - ہے تند و ظرف حوصلۂ اہل بزم تنگ
ساقی سے جام بھر کے پلایا نہ جائے گا

۱۲ - اظہار رنج صحبت غیر اس کے (سے؟) فائدہ
ہم سے تمھاری بزم میں جایا نہ جائے گا

۱۳ - مقصود اپنا کچھ نہ کھلا لیکن اس قدر
یعنی وہ ڈھونڈتے ہیں جو پایا نہ جائے گا

۱۴ - حالی کو دو نہ شعر کی تکلیف ورنہ پھر
یہ خاکسار دل سے بھلایا نہ جائے گا

غزل از دیوان حالی ۱۸۹۳ء صفحہ ۷۰-۱۷

○

۱ - دل سے خیال دوست بھلایا نہ جائے گا
سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا

۲ - تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

۳ - اے دل رضائے غیر ہے شرط رضائے دوست
زنہار بار عشق اٹھایا نہ جائے گا

۱۰ - دیکھی ہیں ایسی ان کی بہت مہربانیاں
اب ہم سے منہ میں موت کے جایا نہ جائے گا

۱۱ - مے تند و ظرف حوصلۂ اہل بزم تنگ
ساقی سے جام بھر کے پلایا نہ جائے گا

۵ - راضی ہیں ہم کہ دوست سے ہو دشمنی مگر
دشمن کو ہم سے دوست بنایا نہ جائے گا

۴ - کیوں چھیڑتے ہو ذکر نہ ملنے کا رات کے
پوچھیں گے ہم سبب تو بتایا نہ جائے گا

۶ - بگڑیں نہ بات بات پہ کیوں جانتے ہیں وہ
ہم وہ نہیں کہ ہم کو منایا نہ جائے گا

۸- ملنا ہے آپ سے تو نہیں حصر غیر پر
کس کس سے اختلاط بڑھایا نہ جائے گا

۱۳- مقصود اپنا کچھ نہ کھلا لیکن اس قدر
یعنی وہ ڈھونڈتے ہیں جو پایا نہ جائے گا

۱۴- جھگڑوں میں اہل دیں کے نہ حالی پڑیں بس آپ
قصہ حضور سے یہ چکایا نہ جائے گا

* *

نواب محمد علی خاں رشکی (متوفی ۲۰ مئی ۱۸۹۸/۹ محرم ۱۳۱۶ھ) اردو فارسی دونوں زبانوں کے شاعر تھے - ان کا دیوان ابھی تک شائع نہیں ہوا - مندرجہ ذیل غزل شریک گلدستہ ہے :

بے بادہ شوق وصل جتایا نہ جائے گا
بے چنگ و نے یہ قصہ سنایا نہ جائے گا
پردہ اٹھا دیا ہے تو کچھ سوچتا نہیں
یہ پردہ زینہار اٹھایا نہ جائے گا
جاں التیام دشمن و دل انقطاع دوست
روٹھو نہ تم کہ ہم سے منایا نہ جائے گا
آنکھیں ملانے میں ہے عبث تم کو احتراز
آنکھیں ہیں دل نہیں کہ ملایا نہ جائے گا
نبضیں چھٹیں ہیں آنکھوں میں دم ہے لبوں پہ جام
آؤ کہ کوئی دم میں بلایا نہ جائے گا
کچھ دیر خلوت اور جو رہتی تو خوب تھا
جلوت میں حرف شوق سنایا نہ جائے گا
جاتے ہیں راہ بھول کے وہ مدعی کے گھر
کیا ہم سے ان کو راہ پہ لایا نہ جائے گا

آتش فشاں ہے عشق پھر اب کوئی کچھ کہے
یہ شوق شعلہ ہم سے بجھایا نہ جائے گا
افسوں ہوں گو ہزار، پہ وحشت نہ ہو گی کم
جب تک فسانہ ان کا سنایا نہ جائے گا
گر ایک بار رخ سے نقاب ان کے اٹھ گیا
پھر راز دل کسی سے چھپایا نہ جائے گا
رشکی بھی آج بیٹھ گیا بزم دوست میں
دشمن تو یہ نہیں کہ اٹھایا نہ جائے گا

* *

قربان علی بیگ سالک (متوفی ۱۸۸۱ء/۱۲۹۷ھ) بھی اردو اور فارسی میں صاحب دیوان تھے لیکن ان کے دونوں دیوان دستیاب نہیں (تلامذۂ غالب صفحہ ۱۴۱) مشاعرے میں انہوں نے یہ غزل پڑھی :

کچھ بھی جو روز حشر بڑھایا نہ جائے گا
قصہ تمام ہم سے سنایا نہ جائے گا
سیلاب گریہ دشمن کاشانہ ہے تو ہو
کیا اس کے دل میں ہے کہ بنایا نہ جائے گا
کھا بیٹھے تیرے ہجر میں کھانے کی ہم قسم
اب کوئی داغ تازہ بھی کھایا نہ جائے گا
جانا تو بزم غیر میں اے ضعف سہل ہے
پر کوئی فتنہ ہم سے اٹھایا نہ جائے گا
دو اضطراب شوق کے طعنے وصال میں
کیا رنج ہجر ہے کہ اٹھایا نہ جائے گا
سو روز باز پرس اگر ہو تو کیا ہمیں
پاس وفا سے حال دکھایا نہ جائے گا

حسرت سے اس قدر نہ گرانبار کیجیے
ورنہ مجھے نظر سے گرایا نہ جائے گا

خط میں سلام لکھتے نہ مجھ کو رقیب کا
یہ حرف رشک بار اٹھایا نہ جائے گا

قاتل یہ جان لے ہمہ تن آرزو ہوں میں
مارا اگر مجھے تو جلایا نہ جائے گا

واعظ ڈرا نہ شعلۂ نار جہنم سے
خس خاک کی طرح سے جلایا نہ جائے گا

آخر دل و جگر ہے بس اب شعلۂ فراق
سوز دروں نہیں کہ بجھایا نہ جائے گا

اس در پہ لاغری سے نہ آیا نظر تو کیا
یہ نقش پسلیوں کا مٹایا نہ جائے گا

جاگا مرا نصیب تو نقصاں نہیں فلک
تو فتنہ تو نہیں کہ جگایا نہ جائے گا

اے چرخ کچھ کمی شب غم میں کہ غیر کا
منصب نہیں کہ تجھ سے گھٹایا نہ جائے گا

سالک چراغ پردۂ فانوس کی طرح
سینہ میں داغ دل کا چھپایا نہ جائے گا

* *

مرزا حسین علی خاں شاداں و خیالی (متوفی ۷ ستمبر ۱۸۸۰ء/

یکم شوال ۱۲۹۶ھ) کی یہ غزل شریک ہے:

گر راز عشق ہے تو چھپایا نہ جائے گا
کیوں کر کہوں کہ حال سنایا نہ جائے گا

ہے اپنی آرزو کہ وہیں دفن ہوں ولے
تا کوئے یار ضعف سے جایا نہ جائے گا

تیر مژہ سے اس کے اگر بچ گیا تو کیا
دل زلف پرشکن سے بچایا نہ جائے گا
جانا عدم کو سہل ہے اس کی تلاش میں
لیکن یہ خوف ہے کہ پھر آیا نہ جائے گا
وہ ناتواں ہوں میں کہ جو ہو جادے کا غبار
صر صر سے وہ غبار اڑایا نہ جائے گا
ہے رنگ عشق رخ سے عیاں دیکھ لیجیے
یہ درد دل نہیں کہ سنایا نہ جائے گا
آیا ہوں در پہ دور سے در تک تو آؤ تم
کیا دو قدم بھی آپ سے آیا نہ جائے گا
ادہ طریق عشق کا آتا نہیں نظر
ے خضر راستہ بھی بتایا نہ جائے گا
مطلب یہ بے خودی سے ہےہم کو کہ کوئی شخص
پوچھے اسے تو ہم سے بتایا نہ جائے گا
دی جان اس امید پہ ہم نے اگر تو کیا
ان سے ہماری نعش پہ آیا نہ جائے گا
ذوق نظارہ سے نہیں باقی ادب کا نام
سر مجھ سے زیر تیغ جھکایا نہ جائے گا
قاصد کے آتے آتے ہم اتنے ہوئے ضعیف
اک حرف اس کے خط کا اٹھایا نہ جائے گا
شاداں نے دل لگا کے بتوں سے برا کیا
اس سے یہ راز عشق چھپایا نہ جائے گا

* *

مرزا یوسف علی خاں عزیز (متوفی ۱۸۷۲ء/۸۹: ۱ھ) بھی
شریک مشاعرہ تھے ۔ انہوں نے دو غزلیں پڑھیں ۔طرحی غزلوں کے

تین شعر مالک رام نے تلامذۂ غالب میں درج کیے ہیں، ایک شعر پہلی غزل اور دو شعر دوسری سے - یہ اشعار حذف کر کے باقی ذیل میں دئے جا رہے ہیں :

سر پند آسماں سے پھرایا نہ جائے گا
کج رو کو راہ راست پہ لایا نہ جائے گا

چھوٹے ہم اس عذاب سے اسلام کے طفیل
کہتے ہیں مر گئے پہ جلایا نہ جائے گا

گر ہے یہی سکوت تو مرقد میں ہم سے کچھ
منکر نکیر کو بھی بتایا نہ جائے گا

ہم کس غضب کے کشتۂ تیغ نگاہ ہیں
عیسیٰ بھی کہتے ہیں کہ جلایا (کذا) نہ جائے گا

کہتے ہیں ہم سے جائے گی معشوق کی صفت
گر تم کو بے گناہ ستایا نہ جائے گا

پاؤں دبائے، خیر مگر شر کی بات کو
کچھ ہو کسی طرح بھی دبایا نہ جائے گا

تم سے قسم تو کھاتے ہیں سم کھا ہی جائیں گے
غم ہجر کا نہیں ہے کہ کھایا نہ جائے گا

ہم اس گلی میں نقش قدم ہو گئے تو کیا
یوں بھی دیار عشق میں جایا نہ جائے گا

کہتے تو ہیں سنے نہ سنے کوئی ہم کو کیا
دل کا گھر نہ کھوئیو، پایا نہ جائے گا

تسلیم امر غیر، کہا جائے کب عزیز
سر روبرو کسی کے جھکایا نہ جائے گا

غزل دیگر

طغیان اشک چشم میں لایا نہ جائے گا
واں دجلہ سے بھنور میں سمایا نہ جائے گا

نقش وفا اگرچہ خدا داد کیوں نہ ہو
لیکن دل صنم میں جمایا نہ جائے گا
کہتے تو ہیں بیان کریں گے ہم ان سے حال
پر فرط بیخودی میں، سنایا نہ جائے گا
دشوار کچھ یہ امر نہیں روٹھ تو رہیں
پر ہے خطر کہ ان سے منایا نہ جائے گا
اس وجہ توڑتے ہیں مرے دل کا آئنہ
تا روے شرمناک دکھایا نہ جائے گا
موقوف ہے ازل سے خورش غم پہ زندگی
موت آ گئی یہ رزق جو کھایا نہ جائے گا
دل سے اٹھے گا شور قیامت اسی طرح
جب تک کہ ہم کو پاس بٹھایا نہ جائے گا
داغ شراب ناب نہیں سجدے کا نشاں
بت خانہ چھوٹے پر بھی مٹایا نہ جائے گا
اپنے اور اس صنم کے ہے جو درمیاں حجاب
سنگ گراں وہ ہم سے ہٹایا نہ جائے گا
ضد کا نشان نام کی دولت ہے آشکار
کہتے ہیں زخم کو بھی ہنسایا نہ جائے گا
آسیب ہے کہ زلف کے مارے ہوئے ہیں ہم
کچھ ہو پر اپنے سر سے یہ سایا نہ جائے گا
آیا نہ جائے واں تو ہے یہ ممکن الوقوع
کیوں کر کہیں کہ ضعف سے جایا نہ جائے گا
گر راستہ میں جلوہ دکھا دے وہ بت عزیز
آنا تو کیا کہ ہوش میں آیا نہ جائے گا

* *

منشی بہاری لال (وفات ۱۹۰۸ء) کا دیوان موجود ہے۔ اس

لیے ان کی غزل جو چار شعروں پر مشتمل تھی خذف کی جاتی ہے۔

* *

مولوی محمد امو جان ولی کی طرحی غزلوں کے تین شعر مالک رام نے تلامذۂ غالب میں دیے ہیں۔ ایک شعر پہلی غزل سے ہے دو دوسری سے۔ ان کو چھوڑ کر باقی اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

دزدانہ اس کی بزم میں جایا نہ جائے گا
منہ اس کے ہمدموں سے چھپایا نہ جائے گا

ازبسکہ سیر جینے سے ہو کر موا ہوں میں
یہ مردہ صور سے بھی جگایا نہ جائے گا

میں داد خواہ اور وہ تغافل شعار ہے
رکتا ہے جی کہ حال سنایا نہ جائے گا

کافر کے دل میں وائے برائی مری جمی
پتھر کا نقش ہے کہ مٹایا نہ جائے گا

مٹی کا گھر نہیں جو اسے توڑتا ہے تو
ظالم یہ قصر دل ہے بنایا نہ جائے گا

کیوں یاد وصل آئی دل دردناک میں
دوشی (شے؟) سے اک جگہ میں سمایا نہ جائے گا

دل میرا غم کدہ ہے، وہ شادی پسند ہے
ایسے کو ایسے گھر میں بلایا نہ جائے گا

شورش بہت ہے دل میں ولی اور لکھ غزل
اب قفل تجھ سے منہ پہ لیایا (لگایا؟) نہ جائے گا

غزل دیگر

زنہار اس پہ ضعف جتایا نہ جائے گا
شاید کہ مجھ سے ظلم اٹھایا نہ جائے گا

نازک بہت ہے وصل میں کیا دیکھیے بنے
پردہ حیا کا اس سے اٹھایا نہ جائے گا
عمر ابد مجھے ملی گو ناتواں ہوا
لب تک کبھی بھی جان سے آیا نہ جائے گا
اس کی نگاہ دزد ہے ' غمزہ ہے راہزن
سرمایۂ شکیب بچایا نہ جائے گا
پہلو سے دل نکال تو پھر نعش دودیا (کذا)
یہ مضطرب زمیں میں دبایا نہ جائے گا
زینت پسند ایسا ہے نازک اسی قدر
رنگ حنا سے ہاتھ چھڑایا نہ جائے گا
یاں تک اُڑا ہے اب تو مرے مرغ رنگ سے
پھر اپنے آشیانہ تک آیا نہ جائے گا
آیا ہے بزم سے میں ولی لیک ضعف سے
جام شراب منہ سے لگایا نہ جائے گا

یادگار غالب ——ایک تحقیقی مطالعہ

(۱)

یادگار غالب اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ اب تک غالب پر متعدد کتابیں نکل چکی ہیں لیکن جو شہرت اس کے حصے میں آئی ہے وہ کسی اور کو حاصل نہیں ہو سکی۔ ہمارے ہاں جو کتاب شہرت پا جائے وہ یا تو ویدوں کی طرح الہامی ہو جاتی ہے یا پھر اسے ادبی طور پر وہ مقام دے لیا جاتا ہے جو عام انسانی پہنچ سے بہت بلند ہو۔ ایشیائی شخصیت پرستی کی رو میں حالی کو مقدس ہستی بنا لیا گیا ہے کہ آج اگر ان کی کتاب کا جائزہ لیتے وقت توصیف کی شاہراہ سے ہٹ کر کوئی رائے پیش کی جائے تو سننے والوں کے برافروختہ ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے متخصصین، اگرچہ اس کتاب کی تنقیدی اور تحقیقی خامیوں سے پوری طرح آگاہ رہے ہیں، لیکن کسی کو کھلم کھلا اظہار خیال کی جرأت نہیں ہوئی۔ عوام نے کتاب کی شہرت ہی کو اس کی ادبی حیثیت کی ضمانت قرار دے لیا ہے، حالانکہ اگر ادبی لحاظ سے دیکھا جائے تو ہم اسے غالب پر لکھی جانے والی کتابوں میں اوسط درجے کی تالیف شمار کرسکتے ہیں۔ یہی حال حیات جاوید کا ہے۔ حیات جاوید اور یادگار غالب کی تحریر کے وقت حالی کو جو سہولتیں اور مواد مل سکتا تھا وہ اس سے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ غالب کے حالات کے لیے

انہوں نے قیام دہلی کے زمانے میں مواد کی فراہمی شروع کر دی تھی ، اور مرزا کی تصانیف ہی سے "جس قدر حالات اور اخلاق و عادات کا سراغ ملا قلمبند کیا اور جو باتیں ذہن میں محفوظ تھیں یا دوستوں کی زبانی معلوم ہوئیں ان کو ضبط تحریر میں لائے"۔۱ یہ مسودات کئی برس بند پڑے رہے ۔ پھر دوستوں کے اصرار سے ۱۸۹۷ء میں انہوں نے غالب پر کتاب لکھنے کا ارادہ کیا ، ان کاغذات کو کھولا ، مرزا کی تصانیف کا پھر سے جائزہ لیا ، کتابوں کو دوبارہ جمع کرکے مطالعہ کیا اور نواب سعیدالدین احمد خان (خلف نواب ضیاءالدین احمد خان) ، سید اکبر مرزا ، سید مظفر مرزا (ابنائے نواب حسام الدین حیدر خان) میر مہدی مجروح اور لالہ بہاری لال مشتاق سے مرزا کے حالات جمع کرائے۔ "مرزا کی لائف جہاں تک اس کی تکمیل ہوسکتی تھی مکمل ہو گئی"۔۲ ماخذوں کی اس لمبی چوڑی فہرست کے باوجود حیات غالب کے بہت سے گوشے نظروں سے اوجھل رہے اور واقعات و سنین کی بے شمار غلطیاں در آئیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا حالی نے دو چار مقامات کے سوا ان اصحاب کے مسودوں سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا ۔ تصانیف کا دو بار مطالعہ کرنے کے باوجود حیات غالب کے سلسلے میں وہ ہمیں مکمل اطلاعات مہیا نہیں کر سکے ۔ یہی حال ان کی دوسری کتاب حیات جاوید کا ہے ۔ اس زمانے میں جو سہولتیں اور مواد مل سکتا تھا آج اس کا امکان کم ہے ، کیونکہ ان بزرگوں کے جاننے والوں اور شاگردوں کی ایک پوری فوج اس وقت موجود تھی لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ حیات جاوید کی "مدلل مداحی" بقول شبلی تصویر کا ایک رخ پیش کرتی ہے ۔ امین زبیری کے خیال میں "حیات و واقعات میں بھی حالی کے قلم سے بیشمار فروگذاشتیں ہوئی ہیں" (العلم ۔ کراچی) ۔ قاضی سراج الدین تو اس بات کے مقر

ہیں کہ اول انہوں نے سر سید کے حالات پر کتاب لکھی اور یورپ جاتے وقت اس کا مسودہ نواب حاجی اسمعیل کے سپرد کیا، جو حالی کو دیا گیا اور اسی کو آگے پیچھے کو کے حالی نے حیات جاوید مرتب کر لی ۔ قاضی سراج الدین سر سید کے ترکی والے مقالات کے انگریزی ترجمے کے دیباچے میں لکھتے ہیں :

"At the instance of Nawab Haji Ismail Khan of Datawali I undertook to compile a Life of Sir Syed Ahmad Khan in Urdu and finished my work in 1892. It was then proposed to publish the book during his life time, provided the Syed agreed to read the manuscript and to correct it. But Sir Syed refused to do so, as he had done to give me any help in the preparation of it. He always, stubbornly maintained, out of modesty, that it was a useless task to write his biography, that is, his works were not worth taking any notice of. It is also certain that he never gave any help to Colonel Garham, which has led to the introduction of many errors in the account of his family and of his early life. Colonel Graham had to be content with such information as he could collect from Sir Syed's friends, and he had to travel all over India to meet those gentlemen who were considered likely to furnish information about the subject.

The idea of publishing the book during Sir Syed's life time had to be abandoned and the manuscript remained with Nawab Haji Ismail Khan. Sir Syed died in March 1898, and as shortly after that, I left for England, the manuscript was made over to Shams-ul Ulama Khawaja Altaf Hussain Hali of Panipat, the great musalman poet of the century and an accomplished prose writer as well. There was surely no person in India, more suited to do justice to the subject and to edit the book. He rewrote the whole book, arranging the subject according to his own ideas, but it appears that Sir Syed's articles on the Khilafat escaped his notice, in fact it seems, he did not take much trouble in collecting more material beyond what I had done.[3]

حقیقت کچھ بھی ہو اس سے انکار نہیں کہ حیات جاوید میں حالی سے واقعات و سنین کی بڑی فاحش غلطیاں ہوئی ہیں ، جن کی ایک معاصر سے بہت کم توقع کی جا سکتی ہے ۔

یادگار غالب میں بھی حال اس سے زیادہ مختلف نہیں ہیں ۔ وہ اپنا نقطۂ نظر ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :

"ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ یہ کتاب اُن تصنیفات میں شمار نہیں ہو سکتی جن کی آج کل ملک میں ضرورت سمجھی جاتی ہے اور جو اہل وطن کی موسمی بیماریوں کے لیے براہ راست دوا اور علاج کا کام دے سکتی ہیں ؛ کیونکہ اس مضمون کے لکھنے پر ہم کو اس اندھی اور بہری دیوی نے مجبور کیا جس کی زبردستی اور حکومت کے آگے مصلحت اندیشی کے پر جلتے ہیں :

مستانہ سخن می رسد از دل بہ لب ما
عشق است کہ بربستہ زبان ادب ما

راقم کو مرزا کے کلام کے ساتھ جو تعلق بدو شعور سے آج تک برابر چلا آتا ہے اس کو چاہو اُس معتقدانہ جوش عصبیت کا نتیجہ سمجھو جو انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتا ہے ، اور چاہو اس یقین کا ثمرہ خیال کرو جو نہایت زبردست شہادتوں سے حاصل ہوتا ہے ۔ بہر تقدیر یہی وہ چیز تھی جس نے ہم کو اس کتاب کے لکھنے پر آمادہ کیا"[۴]

ایسے نقطۂ نظر میں افراط و تفریط کی بڑی گنجائش ہے ۔ اور حالی کی یادگار خامیوں اور کوتاہیوں سے خالی نہیں ۔

(۲)

کتاب دو حصوں میں منقسم ہے ۔ "پہلے حصے میں مرزا کی زندگی کے واقعات ، جہاں تک معلوم ہوسکے ، اور ان کے اخلاق و

عادات و خیالات کا بیان ہے ۔ ۔ ۔ دوسرے حصے میں مرزا کے تمام کلام نظم و نثر اردو و فارسی کا انتخاب اور ہر قسم پر جدا جدا ریویو"[5] پہلے حصے کو ضمنی اور استطراری قرار دیا گیا ہے[6] لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا احساس انہیں کتاب کی تکمیل کے بعد اور دیباچہ لکھتے وقت ہوا ہے ۔ شروع میں ان کا مقصد "مرزا کی زندگی کے عام حالات جس قدر کہ معتبر ذریعوں سے معلوم ہو سکیں اور ان کی شاعری و انشا پردازی کے متعلق جو امور کہ احاطۂ بیان میں آ سکیں اور ابنائے زماں کی فہم سے بالاتر نہ ہوں اُن کو اپنے سلیقے کے موافق قلمبند کرنا" تھا[7] تکمیل کتاب کے بعد چونکہ انہیں دوسرا حصہ پہلے سے زیادہ بڑا اور ابھرا ہؤا نظر آیا ، انہوں نے پہلے حصے کو دوسرے کا ضمیمہ قرار دے دیا ۔ اس کا سراغ اس سے بھی ملتا ہے کہ حالی شروع کے حصے میں اختصار کی طرف مائل تھے اور کتاب کو مختصر پیمانے پر لکھنا چاہتے تھے ۔ چنانچہ کہتے ہیں :

"اگرچہ مقتضائے مقام یہ تھا کہ اس موقع پر مرزا کی چند غزلوں کا موازنہ اُن سب لوگوں کی غزل کے ساتھ کیا جاتا جن کی غزل پر مرزا نے اپنی غزل، بلکہ تمام شاعری کی ، بنیاد رکھی ہے ۔ ۔ ۔ مگر چونکہ اس مختصر میں گنجائش نہیں ۔"[8]

پھر صفحہ ۳۳۲ تک پہنچتے پہنچتے انہیں کتاب کے حجم کا کچھ اندازہ ہو جاتا ہے ۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

"جب تک ایک ایک فقرے کی شرح نہ کی جائے تمام ناظرین اُن سے کچھ لطف نہیں اٹھا سکتے ۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ کتاب کا حجم زیادہ بڑھ جائے گا جس کی وجہ سے کتاب کا مطالعہ ناظرین پر شاق گزرے گا"[9]

پھر صفحہ ۳۶۷ پر جا کر وہ کتاب کی ضخامت کا اقرار کر لیتے ہیں :

"کتاب کا حجم بہت زیادہ بڑھ گیا ہے اس لیے ہم اسی قدر قلیل پر اکتفا کرتے ہیں"[۱۰]

جس طرح مولانا کو یہ خبر نہ تھی کہ ان کی کتاب کتنے صفحے لے جائے گی ، انہیں یہ بھی پتا نہ تھا کہ کتاب کا ڈھانچہ کس طرح بنے گا ۔ انہیں دو واضح لکیروں کا تو احساس تھا کہ ایک حصہ حالات پر دوسرا کلام پر مشتمل ہوگا ، لیکن مواد کی شکل و صورت اور اپنی تنقید کی غایت کی انہیں خبر نہ تھی ، جیسے جیسے کتاب لکھتے گئے راستہ بنتا گیا ہے ۔ نتیجہ یہ ہے کہ کتاب کے مختلف اجزا آپس میں مربوط نہیں ہو سکے اور مجموعی اثر بھی قائم نہیں ہوتا ۔ یہ شاید اس لیے بھی ہؤا کہ حالی جلدی میں تھے ۔ انہیں کتاب مکمل کرنے کی فکر تھی ۔ ایک دوسرا اہم کام چھوڑ کر وہ ادھر متوجہ ہوئے تھے[۱۰] سوانخ عمری میں اختصار بھی اسی خیال سے کیا گیا تھا لیکن دوسرے حصے پر جا کر کتاب کا حجم بڑھنے لگا ۔ ہوتے ہوتے کتاب چار سو صفحوں تک پہنچ گئی (تعداد صفحات ۳۹۱) غالب کا مقابلہ فارسی کے دوسرے شعرا سے کرنا چاہتے تھے ۔ ظہوری کا دیوان ان کے پاس تھا ، جو غلط سلط تھا ، اس کی ایک غزل کی اصلاح کرکے انہوں نے اسی سے غالب کی ایک غزل کا مقابلہ کافی سمجھا[۱۱] ۔ اسی طرح نظیری تک نوبت پہنچی تو کلیات نظیری کا کوئی صحیح نسخہ انہیں دستیاب نہ ہؤا[۱۲] آخر انہیں اس بات کا اقرار کرنا ہی پڑا کہ جلدی میں ہوں :

"افسوس ہے کہ اس وقت کتاب چھپنے کی جلدی میں ہم کو اس قدر مہلت نہیں ملی کہ کلیات نظیری کے صحیح نسخے کے ملنے کا انتظار کیا جاتا اور بعد کامل اطمینان کے اس کے ترکیب بند

میں جو اشعار حل طلب تھے ان کی شرح کی جاتی، جس سے ناظرین کو دونوں ترکیب بندوں میں موازنہ کرنے کا زیادہ موقع ملتا، لیکن ہمارا ارادہ ہے کہ اس کتاب کے دوبارہ چھپنے کی نوبت آئی تو بشرط زندگی نقصان کی تلافی کی جائے گی''۱۳

اس سے کتاب کی ظاہری ہیئت ہی مجروح نہیں ہوئی ان کے طریق تنقید میں بھی رخنے پڑے ہیں - کئی مقامات پر انہیں قاری سے کیے گئے وعدوں سے انحراف بھی کرنا پڑا ہے، آخری حصے میں تو موازنے سے بھی دست کش ہو گئے اور ظہوری و غالب کی نثر کے ٹکڑے محاذ میں درج کرنے پر ہی قناعت کر لی:

''اس بات کا اندازہ کرنا کہ کون سا بیان کس پایہ کا ہے اور کون سا کس درجے کا، ناظرین کے ذوق و وجدان پر چھوڑ دیا جائے''۱۴

کتاب میں ہیئت کے اعتبار سے بے ڈھنگا پن پیدا ہؤا نیز سواد کی چھان پھٹک بھی پورے طور پر نہ ہو سکی، حتیٰ کہ غالب کی اپنی تحریروں سے جو مزید سواد مل سکتا تھا اس سے بھی کماحقہ فائدہ نہ اٹھایا جا سکا - یہی سبب ہے کہ شیخ محمد اکرام، مولانا غلام رسول مہر، قاضی عبدالودود اور بعض دوسرے محققوں کو حالی کے اکثر بیانات کو چیلنج کرنا پڑا - اس زمانے میں جب کہ غالب کے حلقۂ احباب میں اکثر لوگ زندہ تھے، ان کی تالیفات کا بڑا ذخیرہ محفوظ تھا، ان کے خاندان کے افراد زندہ تھے، ان کے حالات کی چھان بین کے امکانات بڑے روشن تھے، حالی یقیناً اس سے بہتر تالیف بھی پیش کر سکتے تھے -

(۴)

حالی خود غالب کے شاگرد تھے اس لیے گمان ہوتا ہے کہ ان

کے اپنے روابط استاد سے بہت ہوں گے ۔ ان کا کہا بظاہر مستند ہونا چاہیے ، لیکن جب دوسرے معاصرین کے بیانات ان سے مختلف ہوں اور خود غالب کی بعض تحریریں ان کے پیش کردہ نتائج کے خلاف جاتی ہوں تو یہ بھی سوچنا پڑتا ہے کہ حالی کے روابط غالب سے کس حد تک تھے ؟ حالی خود یادگار غالب میں لکھتے ہیں :

(۱) اہل دہلی میں جن لوگوں نے مرزا کو جوانی میں دیکھا تھا ان سے سنا گیا ہے کہ عنفوان شباب میں وہ شہر کے نہایت حسین و خوش رو لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے اور بڑھاپے میں بھی ، کہ راقم نے پہلی بار ان کو دیکھا ہے ، حسانت اور خوبصورتی کے آثار ان کے چہرے اور قد و قامت سے نمایاں طور پر نظر آتے تھے ۔[۱۵]

(۲) میں نے غدر سے چند سال پہلے ، جب کہ دیوان عام میں مشاعرہ ہوا کرتا تھا ، صرف ایک دفعہ مرزا صاحب کو مشاعرے میں پڑھتے سنا ہے ۔۔۔ ان کے پڑھنے کی باری سب کے بعد آئی ۔۔۔ اول اردو طرح کی غزل اور اس کے بعد فارسی کی غیر طرح نہایت پر درد آواز سے پڑھی ۔ [۱۶]

اگرچہ جس زمانے میں کہ پہلی بار راقم کا دلی جانا ہوا اس باغ (شعراء کے باغ) میں بہت جھڑ شروع ہو گئی تھی ؛ کچھ لوگ دلی سے باہر چلے گئے تھے اور کچھ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے[۱۷] ۔

ایک دن قبل غروب آفتاب کے مرزا صاحب شام کا کھانا کھا رہے تھے اور کھانے میں صرف شامی

کباب تھے ۔ میں بھی وہیں تھا اور ان کے سامنے بیٹھا رومال سے مکھیاں جھل رہا تھا[۱۸] ۔

(۳) مرزا کی وفات سے چھ برس پہلے کا ذکر ہے کہ ایک روز نواب حسرتی کے مکان پر ، جب کہ راقم بھی وہاں موجود تھا ، آزردہ اور غالب اور سہمان جمع تھے، کھانے میں دیر تھی[۱۹] ۔

(۴) مرزا نے ایک فارسی رسالے کے مؤلف پر ، جو قاطع برہان کے جواب میں لکھا گیا تھا ، ۔ ۔ ۔ ازالۂ حیثیت عرفی کی نالش بھی کی تھی - جب یہ مقدمہ داخل دفتر ہوگیا ، ایک مدت کے بعد لوگوں نے مرزا کے نام گمنام خطوط متضمن سب و شتم بھیجنے شروع کیے ، ۔ ۔ ۔ اتفاق سے انہی دنوں میں نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کے ہمراہ میرا دلی میں آنا ہؤا[۲۰] ۔ شاید اسی روز ۔ ۔ ۔ (غالب کے ہاں بیٹھا تھا کہ ایک خط آیا ، غالب نے مجھے کو دیا ، اس میں گالیاں لکھی تھیں ۔ ۔ ۔) میں (ان دنوں) شیفتہ کے مکان پر مقیم تھا[۲۱] ۔

(۵) مرنے سے چند روز پہلے بیہوشی طاری ہوگئی تھی ۔ ۔ ۔ جس روز انتقال ہؤا اس سے شاید ایک دن پہلے میں ان کی عیادت کو گیا تھا[۲۲] ۔

(۶) مرزا کے جنازے پر ، جب کہ دلی دروازہ کے باہر نماز پڑھی گئی ، راقم بھی موجود تھا[۲۳] ۔

اسی طرح ایک اور جگہ حالی اقرار کرتے ہیں کہ غالب سے انہوں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا ، شیفتہ کا اثر ان پر غالب کے مقابلے

میں کہیں زیادہ ہے۔ ان بیانات سے ظاہر ہے کہ "حالی نے غالب کو سب سے پہلے غدر سے قبل قلعۂ معلیٰ کے مشاعروں میں فارسی اور اردو غزلیں پڑھتے سنا تھا[۲۴]۔ قلعۂ معلیٰ میں ہر مہینے میں پندرہویں اور اُنتیسویں کو مشاعرے ہؤا کرتے تھے۔ نادرات غالب[۲۵] میں پانچ مشاعروں کا ذکر ہے، جن میں غالب شریک ہوئے:

الف ۲۰ فروری ۱۸۴۸ء

ب مئی یا جون ۱۸۵۲ء

ج ۲۵ فروری ۱۸۵۳ء (اس مشاعرے سے غالب جلد اُٹھ آئے تھے۔ سب سے آخر میں ذوق نے پڑھا تھا)

د ۱۰ اپریل ۱۸۵۳ء (غالب نے اردو فارسی دونوں طرحوں میں شعر کہے تھے)

ر جولائی ۱۸۵۳ء

گمان غالب یہ ہے کہ حالی نے انہی مشاعروں میں سے (الف ب ر) میں غالب کو پہلی بار دیکھا ہوگا۔ وہ خود اس بات کا دعویٰ نہیں کرتے کہ شروع میں ان کے غالب کے ساتھ تعلقات گہرے ہو چکے تھے۔ ان کی غالب سے واقفیت غدر کے بعد کے دو سالہ قیام کے دوران میں ہوئی ہوگی، جب کہ بقول اُن کے، انہوں نے غالب کے بعض قصائد ان سے درساً پڑھے[۲۶]۔ ۱۸۶۳ء میں حالی دہلی چھوڑ کر شیفتہ کے پاس چلے گئے۔ وہاں سے خطوط کے ذریعے اپنا کلام بغرض اصلاح بھیجا کرتے تھے۔ محولہ بالا بیانات میں سے پہلے دو اقتباس غدر سے پہلے کے ہیں، جن میں غالب کو (دور سے) دیکھنے کا اقرار ہے، ملاقات کا نہیں۔ غدر کے بعد حالی ۱۸۶۱ء میں دلی جا کر مقیم ہوئے اور اسی زمانے میں غالب سے

قصائد درساً پڑھے - اقتباس نمبر ۳ میں حالی نے غالب سے ملاقات کا ذکر کیا ہے جو ۱۸۶۲ء میں ہوئی تھی (وفات غالب سے ۶ برس پہلے)، پھر ۱۸۶۳ء میں حالی نے دلی چھوڑ دی - اقتباس نمبر ۴ میں ازالۂ حیثیت عرفی کے مقدمے کا ذکر ہے جو ۲ دسمبر ۱۸۶۷ء تا ۲۳ مارچ ۱۸۶۸ء جاری رہا تھا، گویا حالی ۲۳ مارچ ۱۸۶۸ء کے کچھ بعد شیفتہ کے ساتھ دہلی گئے تھے - غالب نے ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء میں وفات پائی - وفات غالب سے ایک روز قبل حالی غالب کی عیادت کو گئے تھے اور پھر اگلے روز اس کے جنازے میں بھی شرکت کی - اس سے حالی اور غالب کے روابط کی مندرجہ ذیل تفصیل ہاتھ آتی ہے -

(۱) حالی نے غدر سے کچھ پہلے غالب کو دیکھا، جب کہ ان کی عمر ڈھل چکی تھی -

(۲) حالی نے ۱۸۶۲ء اور ۱۸۶۳ء کے درمیان غالب سے استفادہ کیا -

(۳) حالی ۱۸۶۳ء کے بعد خط و کتابت کے ذریعے غالب سے اصلاح لیتے رہے اور ان سے دوبار ملے (۱۸۶۸ء میں اور ۱۸۶۹ء میں) -

شیفتہ کی دہلی میں آمد ۱۸۶۳ء اور ۱۸۶۹ء کے مابین مذکورہ بالا تاریخوں کے علاوہ ۱۴ اکتوبر ۱۸۶۶ء میں بھی ہوئی تھی[۲۷] - اسی طرح جب غالب رامپور میں جشن کے موقع پر (اکتوبر ۱۸۶۵ء تا جنوری ۱۸۶۶ء) گئے تھے، تو اس جشن میں شیفتہ بھی شریک ہوئے تھے[۲۸] - معلوم نہیں حالی اس سفر میں ساتھ تھے یا نہیں، بہر حال اتنا ثابت ہے کہ وہ غالب کے چہیتے شاگرد ہرگز نہ تھے - غالب کے قریب آنے کا موقع

انہیں صرف ۱۸۶۱ء اور ۱۸۶۳ء کے مابین ملا ہوگا۔ اگرچہ یہ بھی ثابت نہیں کہ وہ اس زمانے میں غالب کے باقاعدہ شاگرد ہوئے ہوں۔ باقاعدہ شاگردی غالباً شیفتہ کی صحبت میں آنے کے بعد کا واقعہ ہے۔ حکیم غلام رضا خاں دہلوی، جو سید محمد عبدالغفور شہباز کے طب میں استاد تھے اور غالب کے شاگردوں میں تھے، کہتے ہیں:

"مولوی حالی تو گاہ گاہ مرزا صاحب کے ہاں جایا کرتے تھے، ان کی وہاں نشست کچھ زیادہ نہ تھی[۲۹]۔"

غالب سے حالی کے روابط کی داستان اسی قدر ہے۔ حالی اس حالت میں یقیناً نہیں تھے کہ غالب کا زیادہ حال اپنے مشاہدے سے لکھ سکیں۔ انہوں نے یادگار کی تیاری میں غالب کے قریبی حلقۂ احباب میں سے (جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں) بعض کے بیانات لیے، لیکن پوری تگ و دو نہیں کی، نتیجہ یہ ہے کہ احوال غالب میں ان سے سیکڑوں غلطیاں سرزد ہوگئی ہیں۔

(۴)

(۱) ڈاکٹر لطیف اپنی کتاب Ghalib کے صفحہ ۷۳ پر جو کچھ لکھتے ہیں اس کا اردو ترجمہ[۳۰] یہ ہے:

"حالی شاعر (غالب) کی تفصیلات زندگی کے معین کرنے میں ہمارے لیے خضر راہ نہیں بن سکتے۔ ان کی حقیقی دلچسپی غالب کے واقعات زندگی سے وابستہ نہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں واقعات کی ترتیب بہت ہی منتشر اور پراگندہ حالت میں پائی جاتی ہے۔ حالی کی اصل غایت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایک شاعر اور دلفریب شخصیت کی حیثیت سے غالب کی عظمت کا سکہ قارئین کے دلوں پر بٹھایا جائے۔ اس اثر آفرینی کے شوق میں وہ بھول کر

متضاد بیانات کا شکار ہو جاتے ہیں ۔ ملا عبدالصمد کے معاملہ پر ۔ ۔ ۔ غور کیجیے اور ذیل کے دو بیانات کا موازنہ کیجیے :

(الف) مرزا کی چودہ برس کی عمر تھی جب عبدالصمد اُن کے مکان پر وارد ہؤا ہے ، کل دو برس اس نے وہاں قیام کیا ۔ پس جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا کو کس عمر میں اس کی صحبت میسر آئی اور کس قدر قلیل مدت اس صحبت میں گزری تو عبدالصمد اور اس کی تعلیم کا عدم وجود برابر ہو جاتا ہے ۔ اس لیے مرزا کا یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ مجھ کو مبداء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے اور عبدالصمد ایک فرضی نام ہے ۔

(ب) مرزا کے ابتدائی اشعار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تو طبیعت کی مناسبت سے اور زیادہ تر ملا عبدالصمد کی تعلیم کے سبب فارسی کا رنگ ابتدا ہی سے مرزا کی بول چال اور ان کی قوت متخیلہ پر چڑھ گیا تھا ۔

(۲) یکم نومبر ۱۸۵۷ء کو ملکۂ معظمہ کا اعلانِ معافی ہؤا تھا اور ہندوستان کی عنان حکومت کمپنی کے ہاتھ سے نکل گئی تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کا قصیدہ :

در روزگارہا نتوانند شمار یافت
خود روزگار آنچہ دریں روزگار یافت

جس کی نسبت حالی کا خیال ہے کہ اعلان معافی کی تقریب پر لکھا گیا ، اس سے پہلے کا ہے ۔ اعلان

معافی یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ہؤا ، اور یہ قصیدہ اس سے پہلے ستمبر ۱۸۵۸ء میں دستنبو کے ساتھ اس وقت چھپ چکا تھا جب مرزا اس اعلان سے قطعاً بے خبر تھے ۔۔۔ غالباً یہ فتح دہلی کی مبارک یاد ہے نہ کہ اعلان معافی کا شکریہ [۳۱] ۔

(۳) مرزا نے جو فارسی قطعہ مولوی احمد علی کو لکھ کر بھیجا ، اس میں صاحب برہان کے متعلق اپنی درشت گفتار اور زشت گوئی کا اقرار کیا ہے ۔ لیکن مولانا حالی اس مسئلے کے متعلق لکھتے ہیں :

"اگر مرزا صاحب برہان کی نسبت ایسا نہ لکھتے تو بھی مخالفت ضرور ہوتی کیونکہ ہندوستان کے پرانے تعلیم یافتہ ، جو آج کل ایک نہایت کس مپرس حالت میں ہیں ، ان کے لیے کنج خمول و گمنامی سے نکلنے کا کوئی موقع اس کے سوا باقی نہ رہا کہ کسی سربرآوردہ اور ممتاز آدمی کی کتاب کا رد لکھیں اور لوگوں پر ظاہر کریں کہ ہم بھی کوئی چیز ہیں ۔"

حالی نے سر سید کی مخالفت کی بھی یہی وجہ دی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ طرز استدلال کسی اعتراض کا جواب نہیں ۔۔۔ اگر مرزا اس علمی بحث میں ذاتیات کو نہ لے آتے اور بلاوجہ تمسخر و استہزا سے کام نہ لیتے تو مخالفین بھی اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دیتے ، علاوہ ازیں اگر بفرض محال یہ مان بھی لیا جائے کہ پرانے تعلیم یافتہ اپنی شہرت کے لیے مشہور آدمیوں کی مخالفت کرتے ہیں ، تب بھی ناملائم الفاظ کے استعمال میں جو عیب ہے وہ کم نہیں ہو جاتا ۔ حقیقت یہ ہے اور مرزا کے سوانح

نگار کو اس امر کا اقرار کرنا پڑتا ہے کہ مباحثہ کرتے وقت وہ اپنے ترکش کے سارے تیر استعمال کرتے تھے ۔ ۔ ۔ یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ شوخی اور تمسخر کی ابتدا مرزا نے کی تھی[۳۲] ۔

(۴) حالی نے ناظر حسین مرزا کی شہادت سے آزاد کے اس نظریے کی تائید کی ہے کہ بہادر شاہ کے استادوں کو ایک پھول اور ایک کلی سے پورا گلدستہ بنا کر دینا ہوتا تھا ۔ ظفر کی نسبت یہ روایات عام ہے ، لیکن ظفر اور غالب کا کلام آج بھی موجود ہے ، کلیات ظفر میں غالب کے صحیح رنگ کی ایک غزل نہیں اور اگر کلیات ظفر کا عام معیار دیکھا جائے تو یہ خیال ، کہ اس میں غالب کے نتائجِ فکر بھی شامل ہیں ، غالب کی شاعرانہ شہرت کے لیے بہت مفید معلوم نہیں ہوتا[۳۳]۔

(۵) مرزا کے اردو خطوط کی سوانحی اہمیت کو سب مانتے ہیں ، لیکن سوائے ان خطوط کے جن میں مرزا نے اپنے واقعات زندگی مختصراً دہرائے ہیں ، ان میں نو دس سال سے زیادہ کے واقعات نہیں اور چونکہ اس زمانے میں نواب مصطفیٰ خاں کے تعلقات کی وجہ سے حالی کو بھی ۔ ۔ ۔ مرزا سے ملنے کے مواقع ملتے رہتے تھے اس زمانے کے حالات اور قصے یادگار غالب میں بالتفصیل مندرج ہیں ، لیکن مرزا کے ابتدائی حالات میں ابھی کرید اور تلاش کی گنجائش ہے اور جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں اس کے لیے مرزا کے فارسی خطوط بہت مفید ہیں جو ان کی عمر کے ایک بڑے حصے کی کم و بیش مکمل تاریخ ہیں[۳۴] ۔

(۶) حالی نے یادگار غالب میں مرزا کی فارسی نثر کا انتخاب کر کے فارسی کے دوسرے مشہور نثرنویسوں کی تحریروں سے اس کا مقابلہ کیا ہے اور اس کی خوبیاں اور خصوصیتیں بیان کی ہیں؛ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مرزا خود چاہے کچھ کہیں انہوں نے نثر میں اکثر ان فارسی نویسوں کا اتباع کیا جن کی تصانیف ہندوستان میں لکھی گئیں۔۔۔ ان کا طرز تحریر کسی طرح بھی قابل تقلید نہیں۔ ان کتابوں کے مصنف ۔۔۔ اصل مطلب خبط کر دیتے ہیں، مرزا بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں ۔۔۔ ان کے فارسی خطوط ان کے اردو کے مرتبے کو نہیں پہنچتے[۳۵]۔

(۷) ابر گوہر حالی کے خیال میں ان کی مرزا کی آخر عمر کی تصنیف ہے، لیکن جب ۱۸۴۵ء میں سر سید احمد خاں نے آثارالصنادید لکھی تو اس وقت یہ مثنوی ۱۵ ۱۶ جزو کے قریب ہو چکی تھی اور اس کے علاوہ اس مثنوی کے کئی اشعار مہر نیم روز میں درج ہیں جو مارچ ۱۸۵۲ء سے پہلے کی تصنیف ہے[۳۶]۔

(۸) خواجہ حالی مہر نیم روز اور ماہ نیم ماہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مہر نیم روز ختم ہونے کے بعد مرزا نے ذرا آرام لینے کے لیے چند روز توقف کیا تھا۔ ارادہ تھا کہ جلد دوسرا حصہ شروع کریں کہ اتنے میں غدر ہو گیا اور اس حصے کا صرف نام رہ گیا۔"

خواجہ حالی کے اس بیان کے مطابق مرزا ۱۸۵۷ء

تک مہر نیم روز لکھتے رہے ، حالانکہ یہ کتاب ۱۸۵۴ء میں فخرالمطابع سے شائع ہو چکی تھی ۔ مولانا غلام رسول مہر ، امتیاز علی عرشی ، شیخ محمد اکرام ، مالک رام اور دیگر ماہرین غالبیات متفق ہیں کہ مہر نیم روز مارچ ۱۸۵۲ء سے قبل مکمل ہو چکی تھی اور اس کی دلیل میں مرزا کا ایک خط بنام مولوی رجب علی ، جو مارچ ۱۸۵۲ء کا مرقومہ ہے ، پیش کیا جاتا ہے ۔ مختصراً مہرنیم‌روز کی تحریر و ترتیب اس طرح عمل میں آئی :

الف جولائی ۱۸۵۰ء سے جنوری ۱۸۵۱ء تک امیر تیمور سے بابر تک کا حال مکمل ہو چکا تھا ۔

ب ۲۸ مارچ ۱۸۵۱ء تک بابر بادشاہ سے ہمایوں تک کا حال لکھا جا چکا تھا ۔

ج جون ۱۸۵۲ء تک حضرت آدم سے چنگیز خاں تک کے حالات مرتب ہو چکے تھے ۔

د اگست ۱۸۵۴ء تک چنگیز خان سے امیر تیمور تک کے حالات مکمل کر دیے [۳۷] ۔

(۹) مولانا حالی کا خیال ہے کہ جب مرزا قلعہ میں ملازم ہوئے اور مہر نیم روز لکھنے کی خدمت ان کے سپرد ہوئی تو ان کے پاس اتنا وقت نہ رہا کہ فارسی مکتوب نویسی پر کاوش کر سکیں ، اس لیے اُنہوں نے اردو خط و کتابت شروع کی ۔ مولانا حالی کے اس بیان کی تردید میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جسے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ۔ ۱۸۵۰ء سے قبل کا ایک خط مرزا تفتہ

کے نام خطوط غالب مرتبہ مولوی مہیش پرشاد میں موجود ہے - اس کی تاریخ صاحب موصوف نے ۱۸۴۹ء معین کی ہے ، لیکن اصل میں یہ خط اس سے بھی ایک سال قبل یعنی ۱۸۴۸ء کا ہے - ہمارے اس مجموعے میں بھی مرزا کے دو خطوط ۱۸۴۸ء کے موجود ہیں ، جس میں پہلا مارچ ۱۸۴۸ء کا ہے - اس خط کے متعلق یہ کہہ سکتے ہیں کہ مرزا کے فراہم شدہ مکاتیب میں یہ سب سے پرانا خط ہے ؛ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ مرزا نے اس سے قبل اردو میں کوئی خط لکھا ہی نہ تھا۳۸ -

(۱۰) (حالی کا بیان ہے کہ غالب رامپور جاتے ہوئے راستے میں دو تین دن مراد آباد ٹھہرے تھے) یہاں مولانا حالی سے یہ غلطی ہوگئی ہے کہ انہوں نے مرادآباد کے قیام کا زمانہ دو تین دن قرار دیا ہے حالانکہ مرزا غالباً اسی دن وہاں سے روانہ ہوگئے۳۹ -

(۱۱) It will not be improper to say that the yadgar has not fulfilled the expectations which we might have in view of its author's intimate acquaintance with the poet Ghalib. Hali says, "I could, if I liked, gather a collection of the poet's witty sayings." It is a misfortune that he did not do so and has deprived us of the information which would have proved of great help and interest to a future biographer. He could give a full size portrait of Ghalib which he has not cared to do. He has not even solved the problems of the life of his 'hero' and has, rather, put us in a greater confusion. He has not thrown any light on the problem of Ghalib's religion, the ultimate cause of his pessimism, his protest aginst the indifference of his con-

temporaries, to his talents, his stoic unconcern for the changes of political environment, his carelessness with regard to domestic love, his unjustified attacks on the author of 'Burhan-i-Qati,' and many other problems of first rate importance to the biography of Ghalib.[40]

(۱۲) غالب اور حالی کہتے ہیں کہ ان کے دادا شاہ عالم کے عہد میں ہندوستان آئے ، یہ دعویٰ محل نظر ہے ، اس لیے کہ شاہ عالم کی پادشاہی کا زمانہ ۱۷۹۰ء سے شروع ہوتا ہے اور نواب معین الملک عرف میر منو نے ، جن کے پاس غالب کے دادا لاہور میں ملازم تھے ، نومبر ۱۷۵۰ء محرم ۱۲۶۷ھ میں وفات پائی تھی ۔ لہذا ماننا چاہیے کہ مرزا قوقان بیگ خاں ، محمد شاہ کے عہد میں ہندوستان آئے ۔ غالب کا یہ بیان غالباً عام خاندانی روایات پر مبنی ہے ۔ معین الملک کی وفات اور شاہ عالم کی تخت نشینی کے سنین معلوم نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس بیان کی تصحیح نہ کر سکے[۴۱] ۔

(۱۳) حالی کہتے ہیں دہلی میں غالب کا کوئی ذاتی مکان نہ تھا اور ہمیشہ کرایے کے مکانوں میں رہا کیے لیکن خود غالب ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں :

"سی سال است کہ خانہ و کاشانہ فروختہ کو بکو مے گردد ۔ مقامے متعین نہ دارم ، ہر جا کہ سی روم دو سہ سال یا کمتر یا بیشتر می آسایم" ۔

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے دہلی میں غالب کا مکان تھا ، جو ممکن ہے سسرال والوں کی طرف سے ملا ہو ، اُسے فروخت کر ڈالا ۔ بعد ازآں وہ ہمیشہ کرایہ کے

مکانوں میں رہے [۴۲] ۔

(۱۴) غالب نے لمبا سفر صرف ایک کیا ہے ، یعنی کلکتے کا سفر ، جس میں وہ کم از کم تین برس دہلی سے باہر رہے ۔ یہ سفر خاندانی پنشن کے سلسلے میں قانونی چارہ جوئی کے لیے اختیار کیا گیا تھا ۔ اس کی تاریخ کے متعلق ایک عجیب غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے ، جو خود غالب کی ایک تحریر سے پیدا ہوئی ۔ وہ فرماتے ہیں کہ ۱۸۳۰ء میں کلکتے گیا تھا ۔ تمام سوانح نگاروں نے بلا تحقیق اس بیان کو درست تسلیم کر لیا ہے اور نہیں سوچا کہ یہ بیان غالب کی بعض دوسری تحریروں سے مطابقت نہیں رکھتا ۔ تاریخ کے متعلق غالب کا سہو محل استعجاب نہ تھا ، لیکن ان کے وہ مفصل بیانات اس سہو کی بنا پر غلط نہیں مانے جا سکتے تھے جو اُن کی فارسی نثر میں جا بجا موجود ہیں ۔ تعجب ہے کہ اس بارے میں خواجہ حالی مرحوم بھی سہو سے محفوظ نہ رہ سکے [۴۳] ۔ ۔ ۔ ۔ اغلب یہ ہے کہ وہ عید شوال ۱۲۴۲ھ کے بعد یعنی اپریل ۱۸۲۷ء میں (دہلی سے) روانہ ہوئے ہوں [۴۴] ۔

(۱۵) خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ مرزا غالب کلکتہ جاتے ہوئے لکھنؤ پہنچے تھے تو نصیر الدین حیدر اور روشن الدولہ نائب السلطنت تھے ، یہ خواجہ مرحوم کا سہو ہے ۔ غالب کی متعدد تحریرات میں صراحتاً مرقوم ہے کہ ان کے لکھنؤ جانے کے زمانے میں معتمد الدولہ آغا میر نائب السلطنت تھے ۔ معتمد الدولہ کے بعد اعتماد الدولہ میر فضل علی نائب السلطنت تھے ، ان کے بعد منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں کو نیابت کا منصب

عطا ہوا۔ حکیم صاحب کے بعد نومبر ۱۸۳۲ء میں روشن الدولہ نائب السلطنت اور وزیر اعظم بنائے گئے۔ اس وقت غالب کو کلکتہ سے واپس آئے ہوئے کم و بیش دو سال گذر چکے تھے۔ خواجۂ مرحوم کو یہ سہو غالباً اس وجہ سے ہوا کہ نصیر الدین حیدر کے قصیدے میں روشن الدولہ کا بھی ذکر ہے۔ خواجہ صاحب کا یہ ارشاد بھی درست نہیں کہ کلکتہ جانے کے وقت غالب کی عمر کچھ کم چالیس برس کی تھی، دہلی سے روانگی کے وقت غالب کی عمر سنین قمری کے اعتبار سے چند ماہ اور تیس برس کی ہوگی، سنین شمسی کے اعتبار سے چند ماہ کم تیس برس کی ہوگی۔ اگر خواجہ صاحب نے سفر کلکتہ کے متعلق ۱۸۳۰ء والے بیان ہی کو صحیح قرار دے لیا تھا تو اس حالت میں بھی غالب کی عمر زیادہ سے زیادہ تینتیس برس مانی چاہیے تھی اور سیر و سوانح کی کتاب میں تینتیس برس کی مدت کو کچھ کم چالیس برس تعبیر کرنا محتاط طریق بیان نہیں[۴۵]۔

(۱۶) غالب اپنی خاندانی پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں کلکتہ گئے تھے۔ خواجہ حالی نے اس باب میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ اتنا مجمل ہے کہ کوئی شخص اس سے غالب کے مطالبات کی صحیح کیفیت معلوم نہیں کر سکتا اور جس جھگڑے میں ان کی زندگی کا بہت بڑا حصہ صرف ہوا، جس کی وجہ سے ان کا دل مسلسل بیس برس تک گوناگوں توقعات کا مولد و مشہد بنا رہا، اس کی تفصیلات ظاہر نہیں ہو سکتیں[۴۶]۔

(۱۷) (خواجہ حالی پینشن کے بارے میں لکھتے ہیں کہ کول بروک نے ان کے کلکتہ جانے سے پہلے مفید رپورٹ کا وعدہ کیا تھا) لیکن یہ صحیح نہیں کہ کول بروک نے ان کے کلکتہ جانے سے پہلے مفید رپورٹ کا وعدہ کر لیا تھا، میرا خیال ہے کہ کول بروک غالب کے سفر کلکتہ کے وقت تک ریزیڈنٹ ہی نہیں رہے تھے - غالب کی جو تحریریں اوپر پیش کی جا چکی ہیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ کلکتہ میں مقدمہ دائر کرنے تک انہیں یہ خیال بھی نہیں تھا کہ ضابطہ کے مطابق پہلے ریزیڈنسی میں پیش ہونا چاہیے، ورنہ وہ کلکتہ میں بیٹھ کر وکیل کے ذریعے سے ریزیڈنسی میں مقدمہ پیش کرانے کی بجائے خود دہلی میں فیصلہ کرا کر کلکتے جاتے۔ سب سے آخر میں یہ کہ اگر کول بروک ان سے امداد کا وعدہ کر چکے تھے تو کلکتہ سے کرنیل ہنری ایلاک کا سفارش نامہ کول بروک کے نام کیوں بھجوایا جاتا؟ نیز نواب اکبر علی خاں طباطبائی سے منشی التفات حسین کے نام خط کیوں لکھوایا جاتا[۴۷]؟

(۱۸) خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ غالب کے معاملے کے متعلق سر جان میلکم سے استفسار کیا گیا تھا، لیکن دہلی ریزیڈنسی کے پرانے ریکارڈوں میں غالب کی پنشن کے کے متعلق جو کاغذات ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۷ جون ۱۸۰۶ء والا شقہ اس غرض سے سر جان میلکم کے پاس بھیجا گیا تھا کہ وہ اس کی مہر اور دستخط دیکھ کر بتائیں کہ واقعی لارڈ لیک کا ہے یا جعلی ہے؟ سر جان نے شقہ دیکھ کر بتا دیا کہ اس پر مہر

لارڈ لیک ہی کی ہے اور دستخط بھی انہیں کے ہیں۔ غالب کے دعاوی کے متعلق نہ ان سے کچھ پوچھا گیا اور نہ انہوں نے موافق یا مخالف کوئی بات کہی[۴۸]۔

(۱۹) (مولانا ابوالکلام آزاد کا بیان ہے) خواجہ حالی مرحوم نے اس واقعہ (غالب کی قید کی نسبت) جو کچھ لکھا ہے وہ حقیقت کے قطعاً خلاف ہے۔ خواجہ مرحوم سوانح نگاری کو محض مدحت طرازی سمجھتے تھے، اس لیے پسند نہیں کرتے تھے کہ ناگوار واقعات کو ابھرنے دیا جائے۔۔۔ خواجہ صاحب نے اس معاملے کو اس رنگ میں ظاہر کیا ہے کہ گویا کوئی بات نہ تھی، محض چوسر اور شطرنج کا شوق تھا، اس شوق کی تکمیل کے لیے برائے نام بازی بد لیا کرتے تھے، کوتوال چونکہ دشمن تھا اس لیے قماربازی کا مقدمہ بنا دیا، حالانکہ اصلیت بالکل اس کے خلاف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ پورا قمار بازی کا معاملہ تھا اور نواب امیرالدین مرحوم (والی لوہارو) کے لفظوں میں: "مرزا نے اپنے مکان کو جؤا بازی کا اڈا بنا رکھا تھا"[۴۹]۔

(۲۰) حالی کا یہ بیان صحیح نہیں کہ غالب نصیرالدین حیدر کے زمانے میں لکھنؤ گئے۔ غازی الدین حیدر نے ۲۷ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ (مطابق ۱۹ اکتوبر ۱۸۲۷ء) کو وفات پائی اور اُس کا بیٹا نصیرالدین حیدر بادشاہ بنا، غالب اس سے قبل لکھنؤ سے گذر چکے تھے۔ اکتوبر ۱۸۲۷ء میں نواب احمد بخش خاں مرحوم والی فیروز پور جھرکہ کا انتقال ہؤا، غالب کو اطلاع کلکتے کے

راستے میں ملی تھی ، اور اس وقت وہ محض لکھنؤ ہی نہیں بلکہ باندہ سے بھی آگے نکل چکے تھے ، لہذا یہ صحیح نہیں کہ وہ نصیرالدین حیدر کے زمانے میں لکھنؤ گئے[۵۰] ۔

(۲۱) مہر صاحب نے 'غالب' کے صفحہ ۳۳۸ پر حالی کے اس بیان سے بحث کی ہے جو انہوں نے غالب کی آخری عمر کی خوراک کے بارے میں دیا ۔ مقابلے میں دوسرے معاصرین کے اختلافی بیانات دیے ہیں ، پھر صفحہ ۳۴۷ پر الگ عنوان قائم کرکے لکھا ہے :

خواجہ حالی کے بیان کے مطابق مندرجہ ذیل چیزیں ہوتی ہیں :

(۱) پاؤ سیر گوشت کا قورمہ ، ایک پیالے میں بوٹیاں دوسرے میں شوربا ۔

(۲) ایک پیالے میں پھلکے کا چھلکا ، شوربے میں ڈوبا ہوا ۔

(۳) ایک پیالے میں دو تین پیسہ بھر دہی ۔

(۴) ایک پیالے میں کبھی کبھی ایک انڈے کی زردی ، شام کو کسی قدر شامی کباب یا سیخ کے کباب ۔

غالب خود دسمبر ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں اپنی غذا کے متعلق لکھتے ہیں :

صبح کو سات بادام کا شیرہ قند کے شربت کے ساتھ ، دوپہر کو سیر بھر گوشت کا گاڑھا پانی ، قریب شام کے

کبھی کبھی تین تلے ہوئے کباب ، چھ گھڑی رات گئے پانچ روپے بھر شراب خانہ ساز اور اسی قدر عرق شیر ۔ دسمبر ۱۸۶۷ء کے ایک خط فرماتے ہیں :

غذا بہ اعتبار اُرد و برنج مفقود ، محض صبح کو پاؤ سات بادام کا شیرہ ، بارہ بجے آب گوشت ، شام کو چار تلے ہوئے کباب ، بس آگے خدا کا نام[۵۱]۔

(۲۲) خواجہ حالی لکھتے ہیں کہ شراب سوتے وقت پیتے تھے، جو مقرر کر لی تھی اس سے زیادہ کبھی نہیں پیتے تھے ۔ جس بکس میں بوتلیں رہتی تھیں اس کی کنجی داروغہ کے حوالے تھی اور اس کو سخت تاکید کی تھی کہ اگر عالم سرخوشی میں زیادہ پینے پر اصرار بھی ہو تو بھی کنجی نہ دینا ۔

نواب سید امیرالدین احمد خاں مرحوم فرمانروائے لوہارو سے معلوم ہوا کہ بوتلیں ان کے پاس دھری رہتی تھیں ، نواب مرحوم بچپن میں اکثر غالب کے پاس جایا کرتے تھے ۔ فرماتے تھے والدہ محترمہ نے سخت تاکید کر رکھی تھی کہ غالب کی بوتلوں کو ہاتھ نہ لگانا ۔ یہ بھی فرماتے تھے کہ شراب کی بوتلوں کے علاوہ نمکین بادام بھی ایک دو بوتلوں میں بھرے رہتے تھے ، جنہیں گزک کے طور پر استعمال کرتے تھے[۵۲] ۔

(۲۳) ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء مطابق ۳ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ کو دو شنبے کے دن ادب و شعر کا یہ درخشاں آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا ۔ ۔ ۔ وفات کی قمری تاریخ کے متعلق پہلے سے ابہام چلا آتا ہے ۔ خواجہ حالی مرحوم نے صرف

مہینہ لکھا ہے یعنی ذی قعدہ ، لیکن تاریخ نہیں لکھی۔ حضرت عرشی جامع مکاتیب رام پور نے ۲ ذی قعدہ کی تصریح فرمائی ہے ، اسی کی پیروی بعض دوسرے اصحاب نے بھی کی ہے ، لیکن میں نے تقویم دیکھی تو معلوم ہؤا ہے کہ یکم ذی‌قعدہ ۱۲۸۵ھ ۱۳ فروری کو تھی ، ۱۵ فروری کی تاریخ چونکہ پہلے سے مسلم چلی آتی ہے لہذا قمری تاریخ ۲ کے بجائے ۳ ذی قعدہ سمجھنی چاہیے ۔ اس لحاظ سے غالب کی عمر ، بہ حساب قمری ۷۳ برس تین مہینے (حالی نے ۴ مہینے لکھی ہے) ۲۳ دن اور بہ حساب عیسوی اکہتر برس ایک مہینہ انتیس دن ہوئی[۵۳] ۔

(۲۴) خواجہ حالی نے لکھا ہے کہ غالب نے کسی کی ہجو میں کوئی قطعہ یا قصیدہ نہیں لکھا ، صرف ایک قطعہ ان کے قلمی مسودات میں دستیاب ہؤا ہے جو مطبوعہ کلیات میں شامل نہیں ، اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے ایک امیر کی مدح میں فارسی قصیدہ مع عرضداشت ارسال کیا ، اس کا جواب مدت دراز تک نہ ملا تو تقاضے کے طور پر قطعہ بھیجا ، جس کو مشکل سے ہجو ملیح کہا جا سکتا ہے ۔

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ قطعہ نواب وزیر الدولہ والی ٹونک کی خدمت میں بھیجا گیا تھا ۔ خواجہ حالی کا یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ غالب نے کبھی کسی کی ہجو میں کوئی قطعہ نہیں لکھا ، ان کے فارسی کلیات نظم میں کم و بیش چار قطعات ایسے ضرور موجود ہیں جنہیں بہ ہر حال ہجو ہی کے ماتحت لانا

پڑے گا ، البتہ یہ درست ہے کہ ان کی ہجو سودا یا انشا یا فارسی کے بعض ہجوگو شعرا کی بازاری رنگ کی طرح نہیں ہوتی تھی[۵۴] ۔

(۲۵) یادگار غالب میں خواجہ حالی نے غالب کی ایک مثنوی کا ذکر کیا ہے اور اس کا سبب تصنیف یہ لکھا ہے :

''ایک دفعہ بہادر شاہ بہت بیمار ہوئے ، اس زمانے میں مرزا حیدر شکوہ ، جو اکبر شاہ کے بھتیجے اور مرزا سلیمان شکوہ کے بیٹے تھے ، وہ بھی لکھنؤ سے آئے ہوئے تھے اور بادشاہ کے ہاں مہمان تھے ۔ ان کا مذہب اثنا عشری تھا ۔ جب بادشاہ کو کسی طرح آرام نہ ہوا ، تو مرزا حیدر شکوہ کی صلاح سے خاک شفا دی گئی اور اس کے بعد بادشاہ کو صحت ہو گئی ۔ مرزا حیدر شکوہ نے نذر مانی تھی کہ بادشاہ کو صحت ہو جائے گی تو حضرت عباس کی درگاہ میں ، جو کہ لکھنؤ میں ہے ، علم چڑھاؤں گا ، چنانچہ انہوں نے لکھنؤ جا کر عرضداشت بھیجی کہ میرا مقدور نذر ادا کرنے کا نہیں حضور مدد فرمائیں ۔ یہاں سے بادشاہ نے کچھ روپیہ مرزا حیدر شکوہ کو بھجوایا اور انہوں نے بڑی دھوم دھام سے علم چڑھایا ۔ جس میں اودھ کا تمام شاہی خاندان اور امرا و علماء سب شریک تھے اور مجتہد العصر کے ہاتھ سے علم چڑھوایا گیا ۔ اس واقعے کے بعد یہ بات عموماً مشہور ہو گئی کہ بادشاہ شیعہ ہو گئے ۔ اس شہرت کا بادشاہ کو بہت رنج ہوا اور حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے اس کے تدارک کے لیے

کچھ رسالے شائع کرائے اور بہت سے اشتہارات کوچوں اور بازاروں میں چسپاں کرائے گئے اور بادشاہ کے حکم سے مرزا صاحب نے بھی ایک مثنوی فارسی زبان میں لکھی ، جس کا نام غالباً ''دمغ الباطل'' رکھا تھا اور جس میں بادشاہ کو تشیع کے اتہام سے بری کیا گیا تھا ۔''

خواجہ حالی کے اس بیان میں کئی غلطیاں ہیں ، جن میں دو بہت نمایاں ہیں ۔ ایک یہ کہ انہوں نے مرزا حیدر شکوہ کو مرزا سلیمان شکوہ کا بیٹا اور اکبر شاہ کا بھتیجا بتایا ہے ، مگر حقیقت یہ ہے کہ مرزا حیدر شکوہ سلیمان شکوہ کے بیٹے نہیں تھے ، بلکہ ان کے بیٹے مرزا کام بخش کے بیٹے تھے ، یعنی مرزا سلیمان شکوہ کے پوتے تھے ۔ اکبر شاہ مرزا سلیمان شکوہ کے بڑے بھائی تھے اس لیے مرزا حیدر شکوہ اکبر شاہ کے بھتیجے نہیں بلکہ پوتے ہوتے تھے ۔ اس سلسلے میں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ بہادر شاہ ظفر اکبر شاہ کے بیٹے تھے اس لیے وہ مرزا حیدر شکوہ کے چچا ہوئے ۔ مرزا حیدر شکوہ اپنی مثنوی 'شوکت حیدری' میں خود کہتے ہیں :

جناب بہادر شہ نامدار
کہ ہم عم ما ہست و ہم شہریار

دوسری غلطی یہ ہے کہ دمغ الباطل مرزا غالب کی مثنوی کا نام قرار دیا گیا ہے ، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ غالب کی مثنوی کا نہیں بلکہ شیخ امام بخش صہبائی کی مثنوی کا نام تھا ، جس کا ذکر آگے آتا ہے ۔

غالب کی زیر بحث مثنوی کا غالباً کوئی نام نہیں رکھا گیا تھا -

علم کے قضیے کے متعلق خود مرزا حیدر شکوہ کا بیان یہ ہے کہ جس زمانے میں وہ کلکتے میں مقیم تھے، بہادرشاہ‌ظفر بیمار ہوئے - اسی بیماری کی حالت میں انہوں نے ایک خواب میں خود کو حضرت عباس کی درگاہ میں علم چڑھاتے ہوئے دیکھا اور ایک خط میں مرزا حیدر شکوہ کو اس خواب کا حال لکھ بھیجا - جب بہادر شاہ کو صحت ہوئی، تو انہوں نے ایک سونے کا علم بنوا کر مرزا حیدر شکوہ کے بھائی مرزا نورالدین کے ہاتھ بھیجا ، جب حیدر شکوہ کلکتے سے واپس آئے اور بہادر شاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے اس خواب اور علم کا حال زبانی بھی ان سے بیان کیا اور لکھنؤ کے مجتہد سلطان العلماء مولوی سید محمد صاحب کے نام ایک خط لکھ کر مرزا حیدر شکوہ کی معرفت روانہ کیا - انہیں کے ہاتھ ایک خط مرزا نورالدین کو بھی بھیجا ، جس میں ان کو لکھا کہ معلوم نہیں علم حضرت عباس کی درگاہ میں چڑھا دیا گیا یا نہیں ، اگر نہ چڑھایا گیا ہو تو جلد چڑھا دیا جائے۔ قصہ مختصر مرزا حیدر شکوہ کی معرفت بہادر شاہ کا خط وصول ہونے کے بعد مجتہد العصر نے ۲ ربیع‌الاول سنہ ۱۲۷۰ھ کو وہ علم شاہی انتظام اور شاہانہ جلوس کے ساتھ حضرت عباس کی درگاہ میں چڑھا دیا - یہ خبر کچھ جھوٹے سچے حاشیوں کے ساتھ دہلی پہنچی اور وہاں کے علماء و مشائخ نے بہادر شاہ کو دھمکی دی کہ اگر

خبر صحیح ہے تو جمعہ اور عیدین کی نماز کے خطبے سے ان کا نام نکال دیا جائے گا ، اس خوف سے بہادر شاہ مکر گئے اور یہ ظاہر کیا کہ مرزا حیدر شکوہ اور مرزا نورالدین نے ان کی بیماری کے زمانے میں ان کی صحت کے لیے اپنے مذہب کے موافق علم چڑھانے کی نذر مانی تھی ، جس کو انہوں نے اپنے طور پر پورا کیا ہے -

علم کے قضیے نے بہت طول کھینچا اور اس کے بارے میں بہت خط و کتابت ہوئی - اس سلسلے کی تمام اہم تحریریں مرزا حیدر شکوہ نے ایک رسالے میں جمع کر دی ہیں - اسی رسالے میں انہوں نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ امیر تیمور سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک کل مغل بادشاہ مذہباً شیعہ تھے اور اس دعوے کے کچھ ثبوت بھی پیش کیے ہیں - یہ رسالہ ۱۲۷۰ھ میں "رسالہ علم حیدری در عقائد سلاطین تیموری" کے نام سے لکھنؤ میں چھپا تھا اور اس کا ایک نسخہ راقم کے ذخیرۂ کتب میں موجود ہے[۵۵] -

(۲۶) حالی نے یہ لکھا ہے کہ عبدالصمد "یہاں سے چلے جانے کے بعد بھی ۔ ۔ ۔ مدت تک مرزا کو نہیں بھولا - نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کہتے تھے کہ ملا کے ایک خط میں ، جو اُس نے مرزا کو کسی دوسرے ملک سے بھیجا تھا ، یہ فقرہ لکھا تھا : ای عزیز چہ کسی کہ باین ہمہ آزادیہا گاہ گاہ بخاطر می گذری -" قابل توجہ باتیں یہ ہیں کہ حالی نہ تو یہ لکھتے ہیں کہ مصطفیٰ خاں خود حالی سے ناقل تھے اور نہ یہ کہ انہوں نے

عبدالصمد کا خط خود دیکھا تھا ۔ مصطفیٰ خاں ۱۲۲۳ھ میں پیدا ہوئے ہیں اور ان کی ملاقات غالب سے ۱۲۵۰ھ سے کچھ قبل ہوئی ہے ۔ اگر عبدالصمد اصلی شخص ہوتا تو اس وقت ۹۰ کے لپیٹ میں ہوتا اور ایک غیر ملک سے اس زمانے میں مراسلت خارج از بحث ہوتی[۵۶] ۔

(۲۷) حالی کا خیال ہے کہ غالب کو پارسیوں کے مذہبی خیالات اور اسرار ، جن کو فارسی زبان کے سمجھنے میں بڑا دخل ہے ، عبدالصمد سے معلوم ہو چکے تھے ۔ اس پر قاضی عبدالودود صاحب نے مفصل بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ ایران قدیم سے غالب کی واقفیت صفر تھی[۵۷] ۔

(۲۸) مولانا حالی کا دعویٰ ہے ، کہ چند باتوں کے سوا ، غالب نے برہان قاطع کے جھگڑے میں مناسب اعتراضات کیے ہیں ، ان کی صحت کا جائزہ لینے کے لیے ملاحظہ ہو قاضی صاحب کا مقالہ مذکورہ بالا[۵۸] ۔

(۲۹) حالی غالب کی فارسی‌دانی کے بھی قائل ہیں ، قاضی صاحب نے اسے بھی غلط ثابت کیا ہے[۵۹] ۔

(۳۰) حالی لکھتے ہیں کہ غالب کی نظم و نثر اردو فارسی کے دیکھنے سے کبھی اس بات کا خطرہ تک دل میں نہیں گذرتا کہ یہ شخص عربیت اور فن ادب سے ناواقف ہوگا ۔ (اگرچہ یہاں عربی سے ناواقفیت کا اعتراف ہے لیکن فقرے میں ابتدائی ٹکڑہ محل نظر ہے) حالی کی عربی سے ناواقفیت اظہر من الشمس ہے[۶۰] ۔

(۳۱) "(حالی لکھتے ہیں) فن عروض میں بھی ان کو (غالب

کو) کافی دست گاہ معلوم ہوتی ہے۔ اکثر بڑے بڑے نامور شعراء کو دیکھا اور سنا گیا ہے کہ ۔ ۔ ۔ اس فن سے محض نا آشنا ہوتے ہیں ۔ ۔ ۔ مرزا کا حال ایسا نہ تھا ، چنانچہ ، فارسی اردو میں متعدد غزلیں اور نیز ایک آدھ فارسی قصیدہ ایسی ٹیڑھی بحروں میں انہوں نے لکھا کہ اکثر موزوں طبع بغیر واقفیت عروض کے ، ان بحروں میں نہیں چل سکتے ۔" غالب کی عروض دانی کے بارے میں حالی کا قول صحت سے دور ہے ۔ یہ خلاف واقعہ ہے کہ انہوں نے کسی مشکل بحر میں قصیدہ کہا ہے ۔ ان کی چند غزلیں مجتث مثمن مخبون اور منسرح مثمن مطوی مقصور یا مجدوع میں ضرور ہیں ، مگر یہ اوزان فارسی میں کثیرالاستعمال ہیں اور ان میں شعر کہنا چنداں دشوار نہیں ۔ امور ذیل غالب کی عروض دانی کی طرف سوء ظن پیدا کرتے ہیں :

(۱) غالب کا رمل مخبون (فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلاتن) کو ہزج مثمن سالم کہنا اور اسے ایک نئی بحر بتانا (مکاتیب صفحہ ۵۱) حال آنکہ یہ عروض فارسی کی تمام متداول کتابوں میں موجود ہے ، سیکڑوں برس سے شعراء اس میں طبع آزمائی کرتے آئے ہیں ۔ اور شاعروں سے قطع نظر صرف رومی کے دیوان میں اس بحر کی ستر اسی غزلیں ملیں گی (صرف ردیف 'د' میں سات غزلیں ہیں ۔ ۔ ۔) ۔

(۲) غالب کے ایک مصرع : "دل رک رک کر بند ہو گیا ہے غالب" کا ناموزوں ہونا[۶۱] ۔

(۳) غالب کا ایک موزوں مصرع : "چشم مخالفان بیا زن بہ تیر" کو ناموزوں کہنا (تیغ ، صفحہ ۱۴ تا ۲۱)۔
فن قافیہ کی بھی وہی کیفیت ہے جو فن عروض کی ہے۔ بنائے قافیہ حرف روی پر ہے اور یہ آخری حرف اصلی یا اس کے قائم مقام کو کہتے ہیں ، لیکن یہ بات غالب کو معلوم نہ تھی ۔ "گرفت" کی بحث میں دکھایا جا چکا ہے کہ غالب گرفت کی 'ف' کو جو حرف قید ہے ، روی سمجھتے تھے ۔ خاقانی کے ایک شعر سے ، جس میں گرفتہ رفتہ کا قافیہ آیا ہے ، غالب نے فتحۂ را کو ثابت کرنا چاہا تھا ؛ حال آں کہ ، جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں ، گرفتہ میں روی حرف وصل سے مل کر متحرک ہو گئی ہے ، اور اس لیے "ر" کی حرکت داخل قافیہ نہیں ۔ انھوں نے اشعار ذیل کو فتحۂ تائے آتش کے ثبوت میں بھی پیش کیا ہے ۔ اور یہ بھی اتنا ہی غلط ہے جتنا گرفتہ سے فتحۂ را کا ثابت کرنا :

مے گوست حلوائے ہر غم کشے
ندیدہ بجز آفتاب آتشے
میان دو تن جنگ چوں آتش است
سخن چین بدبخت ہیزم کش است

⊙

در بیشۂ ما شیر و شے می باید
ما کوران را عصا کشے می باید
از فقر رسیدہ بوریائے ما را
اندک نفتے و آتشے می باید

کشتہ و گشتہ کے قافیے کو غلط سمجھنے کا ذکر آ چکا

ہے ، اس سلسلے میں انھوں نے عماد کے ایک مطلعے کے بارے میں جو کچھ اپنے ایک شاگرد کو لکھا ہے وہ بھی ملاحظہ طلب ہے) اردو معلیٰ صفحہ ۷۷) اس مطلعے کا ایک ایک قافیہ رفتن بالفتح اور رفتن بالضم ہے۔

غالب ایطا کی نسبت لکھتے ہیں : ''الف فاعل . . . الف نون جمع کا . . . الف نون حالیہ . . . مطلع میں آ پڑے تو ایطاے جلی ہے ، اگر غزل یا قصیدے میں یہ تکرار قافیہ آ پڑے تو ایطاے خفی ہے (عود ہندی صفحہ ۲۱) - ایطاے جلی و ایطاے خفی میں یہ فرق غالب کے سوا شاید ہی کسی نے بتایا ہو - اور خود غالب بھی تفتہ کو ایک خط میں اس کے خلاف لکھ چکے ہیں (اردوے معلی صفحہ ۴۷) - ایطا تکرار قافیہ کا نام ہے - مستند کتابوں میں درج ہے وہ یہ ہے کہ بیت مصرع کے مصرع اول قافیہ کا اعادہ - اگر نظم ایک بیت کی زیادہ کی ہو تو بیت اول کے مصرعہ ثانی کو چھوڑ کر کہیں اور ایک بار ہونے میں مضائقہ نہیں - ایطاے جلی اس صورت میں ہے کہ قافیوں کا ایک ہونا نمایاں ہو ، مثلاً : شہیدان و عندلیبان - ایطاے خفی اس صورت میں ہے کہ قافیوں کا ایک ہونا زیادہ نمایاں نہ ہو ، جیسے : مزدور ، گنجور - مختصر نظموں میں (بیت مصرع اول کے قافیے سے قطع نظر) ایطاے جلی سخت عیب ہے - اگر نظم طویل ہو تو دور دور پر اعادہ ہو سکتا ہے - اس معاملے میں بعض اصناف سخن میں نسبتہً زیادہ آزادی حاصل ہے (تفاصیل ، المعجم ، معیارالاشعار ،

رسالۂ جامی و رسالۂ عطا اللہ میں ملیں گے)[۶۲]۔

(۳۳) مرزا صاحب کی قید کا پورا واقعہ یادگار غالب۔ ۔ ۔ میں ملاحظہ ہو، یہاں صرف اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہ حادثہ ۱۸۴۷ء میں پیش آیا تھا جو از روے حساب ۱۲۶۳ھ کے مطابق ہے۔ لہذا خواجہ حالی مرحوم کا ۱۲۶۴ھ تحریر کرنا کسی طرح درست نہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ شاہ نصیر کے ایک شاگرد گھنشیام لال عاصی دہلوی (متوفی بقول مرتب دیوان ۱۸۶۵ء و بقول خمخانۂ جاوید ج ۵ صفحہ ۵۲۳، ایام غدر ۱۸۵۷ء) نے اس واقعے سے متعلق ایک قطعۂ تاریخ لکھا ہے اور قطعے کے ساتھ نثر میں واقعے کے جزئیات پر روشنی ڈالی ہے؛ اس کے مادہ‌ہاے تاریخ سے بھی ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء نکلتے ہیں[۶۳]۔

(۳۴) (حالی دستنبو کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس میں کوئی عربی لفظ استعمال نہیں ہؤا۔ دستنبو پر سید جمیل الدین صاحب نے نواے ادب بمبئی میں سلسلۂ مضامین جاری کر رکھا ہے۔ جولائی ۱۹۵۵ اور اکتوبر ۱۹۵۶ء کے پرچوں میں مضمون نکل چکے ہیں اور سلسلہ ابھی جاری ہے۔ اسی میں سید صاحب لکھتے ہیں:) یہ تصریحات غمازی کرتی ہیں کہ حالی کو ان کے انداز سوانح نگاری نے یہ ظاہر کرنے سے باز رکھا کہ دستنبو میں عربی الفاظ آ گئے ہیں اور یہ بات نہیں تو وہ باور کرتے تھے کہ بقول غالب اس کتاب میں کوئی عربی لفظ نہیں آیا ع

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے

حالی نے ان الفاظ پر پردہ ڈالا یا ان الفاظ کی اصل ان کی نگاہوں سے چھپی رہی ، اور بعد کے محققین گفتۂ غالب اور نوشتۂ حالی نقل کر دینے پر قانع رہے ۔ دستنبو میں کتنے ہی اوراق عربی الفاظ کے پھولوں سے یوں گل بداماں ہیں کہ ان کا ہر ورق : داماں باغبان و کف گلفروش ہے - یہاں ان میں سے چند چن کر پیش کیے جاتے ہیں (اس کے بعد جمیل الدین صاحب نے مندرجہ ذیل الفاظ عربی لغتوں : صراح ، مصباح اللغات ، قاموس ، تاج العروس ، لسان العرب کے حوالے سے پیش کیے ہیں جو عربی ہیں ۔ قوسین میں اس بات کی توضیح ہے کہ فلاں لفظ دستنبو میں غالب نے کتنی بار استعمال کیا گیا ہے) ماتم (۹) آہ (۵) خنجر (۲) زمزمہ (۳) شرر (۱) صاحب (۴) غوغا (۴) قلعہ (۱) کیسہ (۱) [نوائے ادب صفحہ ۵۱ تا ۶۱] - یہ جولائی ۱۹۵۵ء کے پرچے کا حال ہے ۔ اکتوبر ۱۹۵۶ء کے پرچے میں جاہ (۳) حکیم (۵) صفر (۱) کاید (۴) ملکہ (۱) هزاهز (۱) هزیز (۱) ہوا (۳) نوائے ادب صفحہ ۳۱ تا ۴۱ - مزید قسطیں بھی چلیں ۔

(۳۴) "اگرچہ مولانا حالی نے دعویٰ کیا ہے کہ مرزا نے ظہوری کی غزلوں پر بہت کم غزلیں لکھیں ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی متعدد غزلیں ظہوری کی غزلوں کے جواب میں ہیں[۶۴] -

(۳۵) حالی نے (غالب کے غازی آباد میں سرسید کے مکان پر) دو ایک دن ٹھہرنے کا ذکر کیا ہے لیکن غالب پانچ دن تک سرسید کے مہمان رہے تھے[۶۵]۔

(۳۶) یادگار غالب میں غالب کے مذہب کے متعلق مبہم بیان نے غلط فہمی پیدا کر دی ہے۔ . . حالی نے مرزا صاحب کی فارسی رباعی (بھی) درج کی ہے جس میں خلفاے ثلاثہ پر نجوم کا اطلاق کیا ہے ظاہر ہے کہ یہ بات شیعہ مسلک کے خلاف ہے . . . اہل سنت والجماعت چاروں صحابہ کو ایک جیسا مانتے ہیں اس لیے اس رباعی کا یہ مطلب ہے کہ سوائے علی کے کوئی بھی صحابہ میں سے جانشین نبی نہیں - غالب نواب علاؤالدین خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں ! ''مشرک وہ ہیں جو نومسلموں (خلفاء ثلاثہ کی طرف اشارہ ہے) کو ابوالائمہ (حضرت علی) کا ہم سر مانتے ہیں'' - پھر لکھتے ہیں : ''امامت من اللہ علی علیہ السلام ہے ثم حسن ثم حسین ، اس طرح تا مہدی علیہ السلام'' - ایک اور خط میں دوزخ کے متعلق لکھتے ہیں ''تا کہ مشرکین نبوت مرتضوی و امامت مرتضوی اس میں جلیں'' یہ تمام باتیں ان کے شعیہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں[۶۶] -

(۵)

یہ اغلاط مشتے خروارے ہیں - یادگار غالب کے سرسری مطالعے سے راقم الحروف کو مندرجہ ذیل اغلاط کا بھی پتہ چلا ہے :

(۳۷) ''مرزا اپنی شاعری کا سکہ ، اس وجہ سے کہ زمانہ اس کا اندازہ کرنے سے عاجز تھا ، پبلک کے دلوں پر ، جیسا کہ چاہیے تھا نہیں بٹھا سکے[۶۷]''

''زمانے نے اپنی بساط کے موافق مرزا کی کچھ کم قدر نہیں کی - اُن کا عام کلام اردو ، فارسی ، نظم اور نثر ان کے جیتے جی اطراف ہندوستان میں پھیل گیا - ان کے ماننے والے اور مداح و ثنا خوان

ملک کے ہر گوشے میں پائے جاتے تھے اور اب تک پائے جاتے ہیں[۶۸]۔"

(۳۸) "مرزا نے بعض اردو خطوط میں، اور خاص کر اردو تقریظوں میں، مسجع عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے . . . عربی اور سنسکرت زبان کے سوا اور زبانوں کی مسجع نثروں میں عموماً یہ عیب ہوتا ہے کہ دوسرے میں جو پہلے فقرے کی رعایت سے خواہ نخواہ قافیہ تلاش کرنا پڑتا ہے تو اس میں تصنع اور آورد کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اور اس لیے پہلے فقرے میں دوسرا فقرہ، بسبب لزوم مالا یلزم کے کم وزن ہو جاتا ہے؛ مگر مرزا کی مسجع نثر میں یہ بات بہت کم دیکھی جاتی ہے۔ دوسرے فقرے میں تقریباً ویسی ہی بے تکلفی پائی جاتی ہے جیسے پہلے فقرے میں[۶۹]" "مرزا نے چند تقریظیں اور دیباچے بھی اردو زبان میں لکھے ہیں اور ان میں مسجع اور مقفیٰ عبارت کا التزام کیا ہے۔ جو بے تکلفی اور صفائی مرزا کے اُردو خطوں میں پائی جاتی ہے وہ ان تقریظوں اور دیباچوں میں نہیں ہے؛ خصوصاً سجع کی رعایت نے ان میں آورد اور تصنع کا رنگ پیدا کر دیا ہے؛ لیکن مرزا کو اس میں معذور سمجھنا چاہیے[۷۰]۔"

ان بیانوں میں تضاد ظاہر ہے۔

(۳۹) غالب کے قیام کلکتہ کے بارے میں حالی لکھتے ہیں:

"ان امیدوں کے دھوکے میں وہ پورے دو برس کلکتے میں رہے[۷۱]۔"

یہ بات کسی طرح درست نہیں۔ غالب ۲۱ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہونچے اور، بقول مہر، اواخر ستمبر یا اوائل

اکتوبر ۱۸۲۹ء واپس دہلی کی طرف روانہ ہوئے۔ اس حساب سے ان کی کلکتے میں سکونت زیادہ سے زیادہ انیس ماہ اور چند روز ہوتی ہے اسے پورے دو برس نہیں کہہ سکتے۔

(۴۰) غدر کے حال میں حالی کا بیان ہے:

"ایک روز کچھ گورے مرزا کے مکان میں بھی گھس آئے تھے۔ راجہ کے سپاہیوں نے ہر چند روکا مگر انھوں نے التفات نہیں کیا۔ مرزا دستنبو میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنی نیک خوئی سے گھر کے اسباب کو بالکل نہیں چھیڑا، مگر مجھے اور دونوں بچوں کو اور دو تین نوکروں کو مع چند ہمسایوں کے، کرنل برون کے روبرو، جو میرے مکان کے قریب حاجی قطب الدین سوداگر کے گھر میں مقیم تھے، لے گئے۔ کرنل برون نے بہت نرمی اور انسانیت سے ہمارا نام پوچھا اور رخصت کر دیا۔ سنا ہے کہ جب مرزا کرنل برون کے روبرو گئے تو اس وقت کلاہ پپاخ اُن کے سر پر تھی۔ انھوں نے مرزا کی نئی وضع دیکھ کر پوچھا کہ ول تم مسلمان؟ مرزا نے کہا آدھا۔ کرنیل نے کہا اس کا مطلب؟ مرزا نے کہا شراب پیتا ہوں، سؤر نہیں کھاتا۔ کرنیل یہ سن کر ہنسنے لگا۔ پھر مرزا نے وزیر ہند کی چٹھی، جو ملکۂ معظمہ کے مدحیہ قصیدہ کی رسید اور جواب میں آئی تھی، دکھائی۔ کرنیل نے کہا تم سرکار کی فتح کے بعد پہاڑی پر کیوں نہ حاضر ہوئے؟ مرزا نے کہا: میں چار کہاروں کا افسر تھا، وہ چاروں مجھے چھوڑ کر بھاگ گئے، میں کیوں کر حاضر ہوتا؟ کرنیل نے

نہایت مہربانی سے مرزا اور اُن کے ساتھیوں کو رخصت کر دیا''۲؎ ۔

حالی کے اس بیان میں دستنبو والا حصہ چھوڑ کر متعدد غلطیاں ہیں ۔ غالب نے خود اس واقعے کو اپنے انتخاب میں درج کیا ہے ، جو اُنہوں نے مسٹر میکلوڈ کے لیے ترتیب دیا تھا ، لکھتے ہیں :

''غدر کے دنوں میں نہ شہر سے نکلا ، نہ پکڑا گیا، نہ میری روبکاری ہوئی ، جس مکان میں رہتا تھا وہیں بدستور بیٹھا رہا - بلیماروں کے محلہ میں میرا گھر تھا ۔ ناگاہ ایک دن آٹھ سات گورے دیوار پر چڑھ کے اس خاص کوچے میں اُتر آئے جہاں میں رہتا تھا۔ اس کوچے میں ہمہ جہت ۵۰ یا ۶۰ آدمیوں کی بستی ہو گی ، سب کو گھیر لیا اور ساتھ لے چلے ، مگر گرفتار نہیں کیا اور کسی کو بے حرمت نہیں کیا۔ نرمی سے لے چلے، راہ میں سارجن بھی آ ملا ۔ اس نے مجھ سے صاحب سلامت کے بعد پوچھا کہ تم مسلمان ہو ؟ میں نے کہا آدھا مسلمان ہوں - اس نے کہا ول صاحب آدھا مسلمان کیسا ؟ میں نے کہا : شراب پیتا ہوں ہیم ہوگ۳؎ نہیں کھاتا۔ غرض کہ وہ مجھے کرنل برون کے پاس لے گیا - وہ چاندنی چوک حافظ قطب الدین سوداگر کی حویلی میں اترے ہوئے تھے - باہر نکل آئے اور میرا صرف نام پوچھا - اوروں سے نام بھی پوچھا اور پیشہ بھی پوچھا - نام میرا سن کر فرمایا کہ اسد اللہ خاں بڑے تعجب کی بات ہے کہ باولی پر نہ آئے - میں نے کہا : آپ سنیں تو کہوں - کہا : ہاں کہو - میں نے کہا : تلنگے دروازے سے باہر آدمی کو نکلنے نہیں دیتے تھے ، میں

کیوں کر آتا ۔ اگر کچھ فریب کرکے کوئی بات بنا کے نکل جاتا ، جب باولی کے قریب گولی کی زد میں پہنچتا پہرے والا مجھے گولی مار دیتا ۔ یہ بھی مانا کہ تلنگے باھر جانے دیتے ، گورے گولی نہ مارتے ، میری صورت کو دیکھیے اور میرا حال معلوم کیجیے ۔ بوڑھا ہوں ، پاؤں سے اپاھج ، کانوں سے بہرا ، نہ لڑائی کے لائق ، نہ مشورت کے قابل ، دعا کرتا سو یہاں بھی کرتا رہا ۔ کرنل صاحب ھنسے اور فرمایا : اچھا تم اپنے گھر جاؤ ۔ باقی اھل محلہ سے غرض نہ رکھو ۔ میں خدا کا شکر بجا لایا اور کرنل برون صاحب کو دعا دیتا ہوا اپنے گھر آیا[۴۲] ۔"

(۴۱) "اگرچہ معاش کی طرف سے وہ کبھی زیادہ تنگ نہیں ہوئے مگر حوصلہ اور ھمت کے موافق کبھی استطاعت نصیب نہیں ہوئی[۴۵] ۔"

حالی کے پیش نظر آب حیات تھی ۔ اسی میں غالب کی آخر عمر کی مفلسی کا ذکر ہے ۔ حالی نے جواب کے طور پر "زیادہ تنگ نہیں ہوئے" لکھا ہے ؛ حالانکہ غالب غدر کے ایام میں اور اس کے دو تین برس خاصے تنگ رہے ۔ اس کا اقرار خود حالی نے بھی غالب کےاخلاق و عادات کے ضمن میں کیا ہے کہ وہ انتہائی عسرت میں بھی اپنے ملازموں کو الگ نہ کرتے تھے ۔ لیکن آزاد کو جواب تو دینا تھا ۔

یہ جوابی کارروائی یادگار غالب کا نمایاں پہلو بن جاتی ہے ۔

(۶)

آب حیات یادگار سے پہلے لکھی گئی ۔ اس میں ذوق کو بڑی

اہمیت دی گئی ہے اور غالب کا ذکر اگرچہ مفصل ہے لیکن ذوق و غالب کی چشمک (جس میں ذوق کا پلہ بھاری دکھایا گیا ہے)، غالب کے بارے میں بعض فقروں میں تعریض، بعض ایسے لطائف کا اظہار جن سے غالب کی تحقیر کا پہلو نکلتا ہو؛ آزاد نے ان سے اپنے گل بوٹے سجائے ہیں۔ احمد بخش خاں مرحوم کے بارے میں لکھا ہے: کمال کی دولت ان (غالب) سے لیتے تھے، دنیا کی ضرورتوں میں انہیں آرام دیتے تھے[٦]۔ غالب کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں: اکثر شعر ایسے درجۂ رفعت پر واقع ہوئے ہیں کہ ہمارے نارسا ذہن وہاں تک نہیں پہنچ سکتے[٧]۔ یا پھر لکھتے ہیں! اس میں کلام نہیں کہ وہ اپنے نام کی تاثیر سے مضامین و معانی کے بیشے کے شیر تھے۔ دو باتیں ان کے انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتی تھیں؛ اول یہ کہ معنی آفرینی اور نازک خیالی ان کا شیوۂ خاص تھا، دوسرے چونکہ فارسی کی مشق زیادہ تھی اور اس سے انہیں طبعی تعلق تھا، اس لیے اکثر الفاظ اس طرح ترکیب دے جاتے تھے کہ بول چال میں اس طرح بولتے نہیں[٨]۔ خطوط کے بارے میں فرماتے ہیں: ان کے خطوط کی عبارت ایسی ہے گویا آپ سامنے بیٹھے گل فشانی کر رہے ہیں، مگر کیا کریں کہ اُن کی باتیں بھی خاص فارسی کی خوشنما تراشوں اور عمدہ ترکیبوں سے مرصع ہوتی تھیں۔ بعض فقرے کم استعداد ہندوستانیوں کے کانوں کو نئے معلوم ہوں تو وہ جانیں۔ یہ علم کی کم رواجی کا سبب ہے[٩]۔ آزاد کی اس چھیڑ چھاڑ نے غالب کے طرفداروں کو بھی اکسایا اور حالی سے یادگار لکھوائی۔ اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ کتاب کے اکثر مقامات پر جواب آں غزل کا لطف موجود ہے! "ان اشعار کو مہمل کہو یا بے معنی، مگر اس میں شک نہیں کہ مرزا نے وہ نہایت جانکاہی اور جگرکاوی سے سر انجام کیے ہوں گے؛ جب کہ معمولی اشعار کاٹتے ہوئے لوگوں کا دل دکھتا

ہے تو مرزا کا دل اپنے اشعار نظری کرتے ہوئے کیوں نہ دکھتا ہو گا؟
ظاہرا یہی سبب تھا کہ انتخاب کے وقت بہت سے اشعار جو فی الواقع نظری کرنے کے قابل تھے ان کے کاٹنے پر مرزا کا قلم نہ اٹھ سکا"[۸۰]۔ "ہم کو ان لوگوں سے، جو وجدان صحیح اور ذوق سلیم رکھتے ہیں، امید ہے کہ وہ مرزا کی نثر میں ایک عجیب طرح کی لذت اور ایک نئی طرح کی بانکپن دیکھیں گے جس سے تمام متاخرین کی نثریں بالکل معرا ہیں[۸۱]۔" "الغرض مرزا کی فارسی نظم و نثر کے متعلق ہماری رائے کا ماحصل یہ ہے کہ اُن کا مرتبہ قصیدہ اور غزل میں عرفی اور نظیری سے بالا، اور نثر میں تینوں (عرفی، نظیری، ظہوری) سے بالا تر ہے، اگرچہ مرزا کی غزل میں کہیں کہیں پیچیدگیاں ہیں اور نثر میں بھی اکثر فقرے نہایت پیچیدہ نظر آتے ہیں، جو ممکن ہے کہ اہل زبان کے نزدیک فصاحت کے درجے سے گرے ہوئے ہوں؛ مگر ایسی کسروں سے کسی زبان دان یا اہل زبان کا کلام پاک نہیں ہو سکتا اور نہ ایسی فروگزاشتوں سے کسی کی استادی میں فرق آتا ہے[۸۲]" "مرزا کی غزل کا ڈھنگ اگرچہ میر و سودا کی روش پر نہیں ہے؛ مگر خواص اہل ملک، جو تقلید کی قید سے آزاد ہیں؛ ان کے چیدہ و برگزیدہ اشعار کو میر و سودا کے انتخاب سے کچھ کم پسند نہیں کرتے[۸۳]۔"

حالی کے فقروں میں وہ کاٹ نہیں جو آزاد کے حصے میں آئی ہے؛ لیکن ان جملوں کو آمنے سامنے رکھ کر آزاد کے چابکدست ہاتھ کا وار اور حالی کی انکسارآمیز جوابی کاروائی صاف جھلکتی ہے۔

آزاد کی مخاصمت کے احساس کے باوجود حالی نے آب حیات سے بہت فائدہ بھی اُٹھایا ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ حالی نے آزاد کے کھلے ہوئے ذلت آمیز فقروں اور لطیفوں کو چھوڑ کر باقی ماندہ مواد کو تمام و کمال اپنی کتاب میں سمو لیا ہے، تو بے جا نہ ہوگا۔

یادگار غالب کے دیباچے میں آب حیات کا ذکر نہیں کیا گیا اور ایک جگہ نام لے کر حوالہ دیا ہے ۔ یہ دونوں اقتباس ایک دوسرے متن میں بھی صرف کے محاذ میں درج کیے جاتے ہیں :

یادگار غالب

تذکرہ آب حیات میں لکھا ہے کہ ۱۸۴۲ء میں، جب کہ دہلی کالج نئے اصول پر قائم کیا گیا ، مسٹر ٹامسن سکرٹری ، گورنمنٹ ہند ، جو آخر کو اضلاع شمال و مغرب میں لفٹننٹ گورنر ہو گئے تھے ، مدرسین کے امتحان کے لیے دلی میں آئے اور چاہا کہ جس طرح سو روپیہ ماہوار کا ایک عربی مدرس کالج میں مقرر ہے ، اسی طرح ایک فارسی کا مدرس مقرر کیا جائے ۔ لوگوں نے مرزا اور مومن خاں اور مولوی امام بخش کا ذکر کیا ۔ سب سے پہلے مرزا صاحب کو بلایا گیا ۔ مرزا پالکی میں سوار ہو کر صاحب سکرٹری کے ڈیرے پر پہنچے ۔ صاحب کو اطلاع ہوئی ، انھوں نے فوراً بلا لیا ۔ مگر یہ

آب حیات

۱۸۴۲ء میں گورنمنٹ انگلشیہ کو دہلی کالج کا انتظام از سر نو منظور ہوا ۔ ٹامسن صاحب ، جو کئی سال تک اضلاع شمال و مغرب کے لفٹننٹ گورنر بھی رہے ، اس سکرٹری تھے ۔ وہ مدرسین کے امتحان کے لئے دہلی آئے اور چاہا کہ جس طرح سو روپیہ مہینہ کا ایک مدرس عربی کا ہے ایسا ہی فارسی کا بھی ہو ۔ لوگوں نے چند کاملوں کے نام بتائے اُن میں مرزا کا نام بھی آیا ۔ مرزا صاحب حسب الطلب تشریف لائے ۔ صاحب کو اطلاع ہوئی مگر یہ پالکی سے اُتر کہ اس انتظار میں ٹھہرے کہ حسب دستور قدیم سکرٹری استقبال کو تشریف لائیں گے ۔ جب کہ نہ وہ ادھر سے آئے ، نہ یہ ادھر سے گئے اور دیر ہوئی ، تو صاحب

یادگار غالب

پالکی سے اُتر کر اس انتظار میں ٹھہرے رہے کہ دستور کے موافق صاحب سکرٹری ان کے لینے کو آئیں گے - جب بہت دیر ہو گئی اور صاحب کو معلوم ہوا کہ اس سبب سے نہیں آئے ، وہ خود باہر چلے آئے اور مرزا سے کہا کہ جب آپ دربار گورنری میں تشریف لائیں گے تو آپ کا اسی طرح استقبال کیا جائے گا ؛ لیکن اس وقت آپ نوکری کے لیے آئے ہیں اس موقع پر وہ برتاؤ نہیں ہو سکتا - مرزا صاحب نے کہا : گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ اس لیے کیا ہے کہ اعزاز کچھ زیادہ ہو ، نہ اس لیے کہ موجودہ اعزاز میں بھی فرق آئے - صاحب نے کہا : ہم قاعدے سے مجبور ہیں - مرزا صاحب نے کہا : مجھ کو اس خدمت سے معاف رکھا جائے - اور کہہ کر چلے آئے -
(صفحہ ۲۶)

آب حیات

سکرٹری نے جمعدار سے پوچھا - وہ پھر باہر آیا کہ آپ کیوں نہیں چلتے - انھوں نے کہا صاحب استقبال کو تشریف نہیں لائے میں کیوں کر جاتا - جمعدار نے جا کر پھر عرض کی - صاحب باہر آئے اور کہا : جب آپ دربار گورنری میں بہ حثیت ریاست تشریف لائیں گے تو آپ کی وہ تعظیم ہو گی ؛ لیکن اس وقت آپ نوکری کے لیے آئے ہیں ، اُس وقت تعظیم کے مستحق نہیں - مرزا صاحب نے فرمایا کہ گورنمنٹ کی ملازمت باعث زیادتیٔ اعزاز سمجھتا ہوں نہ یہ کہ بزرگوں کے اعزاز کو بھی گنوا بیٹھوں - صاحب نے فرمایا کہ ہم آئین سے مجبور ہیں - مرزا صاحب رخصت ہو کر چلے آئے - (صفحہ ۵۰۸)

(۷)

دیباچے میں حالی نے جن صاحبوں کی امداد کا اقرار کیا ہے کتاب کے متن میں ان کی نوازشوں کی تفصیل آب حیات کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ آزاد تو اس قابل ھی نہیں سمجھے گئے کہ ان کی کتاب سے بھرپور استفادے کا اقرار ہی کر لیا جاتا۔ آب حیات کا ایک خاصہ حصہ واوین کے بغیر یادگار غالب کے اوراق میں دکھائی دیتا ہے۔ معمولی لفظی تغیر و تبدل نے آزاد کی دلکش عبارت کو حالی کی "اُبلی کھچڑی" میں تو بدل دیا ہے؛ لیکن اکثر جگہ روزمرہ، محاورہ اور زبان و بیان کے کینڈوں کی مماثلت پرائے مال کی غمازی کرتی ہے۔ پہلے باب میں جہاں غالب کے خاندانی حالات درج ہوئے ہیں، چند جزئی اضافوں کے سوا، بیشتر حصہ آب حیات سے مستعار ہے۔ مثلاً:

یادگار غالب	آب حیات
ایک مدت دراز تک تور کی نسل ملک و دولت سے بے نصیب رہی مگر تلوار کبھی ھاتھ سے نہ چھوٹی۔ (صفحہ ۹)	خاندان کا سلسلہ افراسیاب بادشاہ توران سے ملتا ہے۔ جب تورانیوں کا چراغ کیانیوں کی ہوائے اقبال سے گل ھوا تو غریب خانہ برباد جنگلوں پہاڑوں میں چلے گئے؛ مگر جوھر کی کشش نے تلوار ھاتھ سے نہ چھوڑی (صفحہ ۵۰۱)
بخت خفتہ نے پھر کروٹ لی اور سلجوق خاندان میں ایک زبردست سلطنت کی بنیاد قائم	سیکڑوں برس کے بعد پھر اقبال ادھر جھکا اور تلوار سے تاج نصیب ہوا۔ چنانچہ سلجوق

یادگار غالب	آب حیات
ہو گئی (صفحہ ۹)	خاندان کی بنیاد انہی میں قائم ہو گئی ۔ صفحہ (۵۰۱)
نجف خاں نے مرزا کے دادا کو سلطنت کی حشمت کے موافق ایک عمدہ منصب دلوایا اور پہاسو کا سیر حاصل پرگنہ ذات و رسالے کی تنخواہ میں مقرر کر دیا (صفحہ ۱۰)	اور اپنی لیاقت اور خاندان کے نام سے پہاسو کا ایک پرگنہ سیر حاصل ذات و رسالے کی تنخواہ میں لیا ۔ (صفحہ ۵۰۱)
چند روز بعد وہاں سے حیدر آباد پہونچے اور سرکار آصفی میں تین سو سوار کی جمعیت سے کئی برس تک ملازم رہے ، مگر وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی ۔ (صفحہ ۱۱)	چند روز بعد حیدرآباد میں جا کر نواب نظام علی خاں بہادر کی سرکار میں تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہے کئی برس کے بعد خانہ جنگی کے بکھیڑے میں یہ صورت بھی بگڑی (صفحہ ۵۰۱)
مہر نیم روز ختم ہونے کے بعد مرزا نے ذرا آرام لینے کے لیے چند روز توقف کیا اور ارادہ تھا کہ جلد دوسرا حصہ شروع کریں کہ اتنے میں غدر ہو گیا اور اس حصے کا نام ھی نام رہ گیا ۔ (صفحہ ۳۱ ، ۳۲)	ارادہ تھا کہ اکبر سے لے کر بہادر شاہ تک کا حال دوسری جلد میں لکھیں اور ماہ نیم ماہ نام رکھیں کہ غدر ہو گیا ۔ (صفحہ ۵۲۱)

یہ ٹکڑے واوین کے بغیر آئے ہیں۔ اسی طرح دوسرے مقامات پر حالی نے آزاد سے خوشہ چینی کی ہے۔ لطائف و ظرائف بھی زیادہ آب حیات ہی سے لیے گئے ہیں :

یادگار غالب	آب حیات
مولوی امین الدین کی کتاب قاطع برہان کا جواب مرزا نے کچھ نہیں دیا؛ کیونکہ اس میں فحش و ناشائستہ الفاظ کثرت سے تھے۔ کسی نے کہا: حضرت! آپ نے اس کا کچھ جواب نہیں لکھا۔ مرزا نے کہا: اگر کوئی گدھا تمھارے لات مارے تو کیا تم اس کے لات مارو گے؟ (صفحہ ۴۴)	مرزا کی قاطع قاطع کے بہت سے شخصوں نے جواب لکھے ہیں اور بہت زبان درازیاں کی ہیں۔ کسی نے کہا: حضرت آپ نے فلاں شخص کی کتاب کا جواب نہ لکھا۔ فرمایا: "بھائی اگر کوئی گدھا تمھارے لات مارے تو تم اس کا کیا جواب دو گے؟" (صفحہ ۵۲۸)
رمضان کا مہینہ تھا، ایک سنی مولوی مرزا سے ملنے کو آئے۔ عصر کا وقت تھا۔ مرزا نے خدمت گار سے پانی مانگا۔ مولوی نے تعجب سے کہا کیا جناب کو روزہ نہیں ہے؟ مرزا نے کہا: "سنی مسلمان ہوں، چار گھڑی دن رہے روزہ کھول لیتا ہوں"۔ (صفحہ ۶۹)	ایک مولوی صاحب، جن کا مذہب سنت والجماعت تھا، رمضان کے دنوں میں ملاقات کو آئے۔ عصر کی نماز ہو چکی۔ مرزا نے خدمت گار سے پانی مانگا۔ مولوی صاحب نے کہا: حضرت غضب کرتے ہیں، رمضان میں روزے نہیں رکھتے۔ مرزا نے کہا: "سنی مسلمان ہوں، چار گھڑی دن سے روزہ کھول لیا کرتا ہوں۔" (صفحہ ۵۲۰)

یادگار غالب	آب حیات
ایک دفعہ رات کو پلنگ پر لیٹے ہوئے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تاروں کی ظاہری بد نظمی اور انتشار دیکھ کر بولے: "جو کام خودرائی سے کیا جاتا ہے اکثر بے ڈھنگا ہوتا ہے۔ ستاروں کو تو دیکھو، کس ابتری سے بکھرے ہوئے ہیں؛ نہ تناسب نہ انتظام نہ بیل ہے نہ بوٹا ہے؛ مگر بادشاہ خود مختار ہے کوئی دم نہیں مار سکتا"۔ (صفحہ ٦٥)	ایک رات کو انگنائی میں بیٹھے تھے چاندنی رات تھی، تارے چھٹکے ہوئے تھے، آپ آسمان کو دیکھ کر فرمانے لگے کہ جو کام بے صلاح و مشورہ ہوتا ہے بے ڈھنگا ہوتا ہے۔ خدا نے ستارے آسمان پر کسی سے مشورہ کرکے نہیں بنائے، جبھی بکھرے ہوئے ہیں؛ نہ کوئی سلسلہ نہ زنجیر نہ بیل نہ بوٹہ۔ (صفحہ ٥٠٣)
غدر کے بعد، جب کہ پنشن بند تھی اور دربار میں شریک ہونے کی اجازت نہ ہوئی تھی، پنڈت موتی لال میر منشی پنجاب، مرزا صاحب سے ملنے کو آئے، کچھ پنشن کا ذکر چلا۔ مرزا صاحب نے کہا: "تمام عمر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر اور ایک دفعہ نماز پڑھی ہو تو گنہگار، پھر میں نہیں جانتا کہ سرکار نے کس طرح مجھے باغی مسلمانوں میں شمار	غدر کے چند روز بعد پنڈت موتی لعل، کہ ان دنوں میں مترجم گورنمنٹ پنجاب کے تھے، صاحب چیف کمشنر پنجاب کے ساتھ دلی گئے اور حب الوطن اور محبت فن کے سبب سے مرزا صاحب کی ملاقات کی۔ ان دنوں میں پنشن بند تھی، دربار کی اجازت نہ تھی۔ مرزا بہ سبب دل شکستگی کے شکوہ شکایت سے لبریز ہو رہے تھے۔ اثنائے گفتگو میں کہنے لگے

یادگار غالب

کیا - (صفحہ ٦٨)

شراب کے متعلق ان کی ظرافت آمیز باتیں بہت مشہور ہیں - ایک شخص نے ان کے سامنے شراب کی نہایت مذمت کی اور کہا کہ شراب خور کی دعا قبول نہیں ہوتی - مرزا نے کہا : 'بھائی جس کو شراب میسر ہے اس کو اور کیا چاہیے جس کے لیے دعا مانگے ؟ (صفحہ ٦٦)

آب حیات

کہ عمر بھر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر اور ایک دفعہ بھی نماز پڑھی ہو تو مسلمان نہیں ، پھر میں نہیں جانتا کہ مجھے سرکار نے باغی مسلمانوں میں کس طرح شامل سمجھا - (صفحہ ٥٢٩)

ایک شخص نے ان کے سنانے کو کہا کہ شراب پینا سخت گناہ ہے - آپ نے ہنس کر کہا : بھلا جو پیے تو کیا ہوتا ہے ؟ انھوں نے کہا کہ ادنیٰ بات یہ ہے کہ دعا نہیں قبول ہوتی - مرزا نے کہا : آپ جانتے ہیں ، شراب پیتا کون ہے؟ اول تو وہ کہ ایک بوتل اولڈ ٹام کی با سامان سامنے حاضر ہو، دوسرے بے فکری ، تیسرے صحت ، آپ فرمائیے کہ جسے یہ سب کچھ حاصل ہو اُسے اور چاہیے کیا جس کے لیے دعا کرے ؟ (صفحہ ٥٣١)

کہیں کہیں آزاد کے بیانات میں حالی نے معمولی اصلاح بھی

کی ہے - مثلاً :

یادگار غالب

اس وقت کلاہ پپاخ ان (غالب) کے سر پر تھی -
(صفحہ ۶۳)

۱۸۲۷ء میں، جب کہ نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم کلکتے گئے ہوئے تھے، مولوی محمد عالم مرحوم نے، جو کلکتہ کے ایک دیرینہ سال فاضل تھے، نواب صاحب سے بیان کیا کہ، جس زمانے میں مرزا صاحب یہاں آئے ہوئے تھے، ایک مجلس میں جہاں مرزا بھی موجود تھے اور میں بھی حاضر تھا، شعرا کا ذکر ہو رہا تھا، اثنائے گفتگو میں ایک صاحب نے فیضی کی بہت تعریف کی، مرزا نے کہا : فیضی لوگ جیسا سمجھتے ہیں ویسا نہیں ہے - اس پر بات بڑھی - اُس شخص نے کہا : فیضی پہلی ہی بار اکبر کے روبرو گیا تھا،

آب حیات

سر پر اگرچہ کلاہ پاپاخ نہ تھی مگر لمبی ٹوپی سیاہ پوستین کی ہوتی تھی -
(صفحہ ۶۰۵)

اُردوئے معلیٰ میں مرزا حاتم علی بیگ مہر کو تحریر فرماتے ہیں : "میرا ایک قطعہ ہے کہ وہ میں نے کلکتہ میں کہا تھا - تقریب یہ کہ مولوی کرم حسین ایک میرے دوست تھے، انھوں نے ایک مجلس میں چکنی ڈلی بہت پاکیزہ اور بے ریشہ اپنے کفدست پر رکھ کر مجھ سے کہا کہ اس کی کچھ تشبیہات نظم کیجیے - میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ لکھ کر ان کو دیا اور صلہ میں وہ ڈلی اُن سے لے لی - غرض کہ بیس بائیس پھبتیاں ہیں؛ اشعار سب کب یاد آتے ہیں، بھول گیا -
(صفحہ ۵۲۲)

یادگار غالب	آب حیات
	اُس نے ڈھائی سو شعر کا قصیدہ اُسی وقت ارتجالاً کہہ کر پڑھا تھا۔ مرزا بولے: "اب بھی اللہ کے بندے ایسے موجود ہیں کہ دو چار سو نہیں تو دو چار شعر تو ہر موقع پر بداہتہً کہہ سکتے ہیں۔" مخاطب نے جیب سے چکنی ڈلی نکال کر ہتھیلی پر رکھی اور مرزا سے درخواست کی کہ اس پر کچھ ارشاد ہو۔ مرزا نے گیارہ شعر کا قطعہ اُسی وقت موزوں کر کے پڑھ دیا۔ (صفحہ ۳۳)
مرزا صاحب کو مرنے سے بیس برس پہلے اپنی تاریخ فوت کا ایک مادہ ہاتھ آیا، وہ بہت بھایا اور اسے موزوں فرمایا: (تاریخ فوت: غالب مرد) اس حساب سے ۱۲۷۷ھ میں مرنا چاہیے تھا۔ اسی سال شہر میں سخت وبا آئی، ہزاروں آدمی مر گئے۔ اُن دنوں دلی	آخر عمر میں موت کی بہت آرزو کیا کرتے تھے۔ ہر سال اپنی وفات کی تاریخ نکالتے اور یہ خیال کرتے کہ اس سال ضرور مر جاؤں گا۔ ۱۲۷۷ھ میں انھوں نے اپنے مرنے کی تاریخ کہی کہ "غالب مرد۔" اس سے پہلے کئی مادے غلط ہو چکے تھے۔ منشی جواہر

یادگار غالب

سنگھ جوہر تخلص مرزا صاحب
کے مخصوصین میں سے تھے ،
اُن سے مرزا صاحب نے اس
مادے کا ذکر کیا ۔ انھوں نے
کہا : حضرت ! انشا اللہ یہ
مادہ بھی غلط ثابت ہوگا ۔ مرزا
نے کہا : "دیکھو صاحب تم
ایسی فال منہ سے نہ نکالو ۔ اگر
یہ مادہ مطابق نہ نکلا تو بھی
سر پھوڑ کر مر جاؤں گا ۔"
ایک دفعہ شہر میں سخت وبا
پڑی ۔ میر مہدی حسین مجروح
نے دریافت کیا کہ حضرت! وبا
شہر سے دفع ہوئی یا ابھی تک
موجود ہے ؟ اس کے جواب
میں لکھتے ہیں : "بھئی کیسی
وبا ! جب ایک ستر برس کے
بڈھے اور ستر برس کی بڑھیا
کو نہ مار سکے تف بر این
وبا ۔" (صفحہ ۸۸، ۸۹) مرنے
سے آٹھ برس پہلے انھوں
نے ایک مادہ تاریخ اپنی
وفات کا نکالا تھا ، جس میں

اب حیات

کی بربادی کا غم تازہ تھا ؛
چنانچہ میر مہدی صاحب کے
جواب میں آپ فرماتے ہیں
. . . میاں ۱۲۷۷ھ کی بات
غلط نہ تھی ۔ مگر میں نے
وبائے عام میں مرنا اپنے لائق
نہ سمجھا ۔ اس میں میری کسر
شان تھی ۔ بعد رفع فساد ہوا
کے سمجھ لیا جائے گا ۔
(صفحہ ۵۳۱ ، ۵۳۲)

آب حیات	یادگار غالب
	۱۲۵۷ھ نکلتے تھے ۔ اتفاق سے اسی سال شہر میں وبا آئی ۔ اس امر کی نسبت ایک خط میں لکھتے ہیں : "میاں ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی ۔ میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا ۔ واقعی اس امر میں کسر شان تھی ۔ بعد رفع فساد سمجھ لیا جائے گا ۔" (صفحہ ۱۰۵)
آخر ۷۳ برس کی عمر ۱۸۶۹ء ۱۲۸۵ھ میں جہان فانی سے انتقال کیا اور بندۂ آثم نے تاریخ لکھی : آہ غالب بمرد ۔ (صفحہ ۵۰۴)	آخر ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ کی دوسری اور فروری کی پندرھویں کو بہتر برس اور چار مہینے کی عمر میں دنیا سے رحلت کی . . . ان کی وفات کی تاریخیں ، جو مدت تک ہندوستان کے اُردو اخباروں میں چھپتی رہیں ، وہ گنتی اور شمار سے باہر ہیں ۔ صرف ایک تاریخ ، جس میں دس بارہ آدمیوں کو توارد ہوا ، یاد رکھنے کے قابل ہے ، یعنی "آہ غالب بمرد ۔" (صفحہ ۹۰)
. . . خوراک دو تین برس	آخر میں ان کی خوراک

یادگار حیات

بہت کم ہو گئی تھی - صبح کو
وہ اکثر شیرہ بادام پیتے تھے،
دن کو جو کھانا ان کے لیے گھر
میں سے آتا تھا اس میں صرف
پاؤ سیر گوشت کا قورمہ ہوتا
تھا - ایک پیالے میں بوٹیاں ،
دوسرے میں لعاب یا شوربا -
ایک پیالی میں ایک پھلکے کا
چھلکا شوربے میں ڈوبا ہوا ،
ایک پیالی میں کبھی کبھی
ایک انڈے کی زردی ، ایک
اور پیالی میں دو تین پیسہ بھر
دہی، اور شام کو کسی قدر
شامی کباب یا سیخ کباب ،
بس اس سے زیادہ ان کی خوراک
اور کچھ نہ تھی -
(صفحہ ٦٢)

آب حیات

پہلے یہ رہ گئی تھی کہ صبح کو
سات بادام کا شیرہ ، ۱۲ بجے
آب گوشت ، شام کو کباب
تلے ہوئے - (صفحہ ۵۰۴)

(۹)

اس سے قطع نظر کہ یہ اصلاحات ہر جگہ درست بھی ہیں یا نہیں، ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ حالی پر آزاد کے احسانات کہیں زیادہ ہیں - اثر پذیری مواد لے لینے تک محدود نہیں ؛ بلکہ غالب کے کردار کی نوک پلک بھی آزاد کی مشاطگی کی مرہون منت ہے - خاندان کی محبت ، آن بان کا خیال ، تعلقات خانہ‌داری سے

دق ہونا ، زمانے کی بے قدری کا احساس ، لطیفہ گوئی ، شراب خوری ، عام روش سے ہٹ کر بات کہنے کا ڈھنگ ؛ غالب کے کردار کی ان خصوصیات کا جو خاکہ آزاد نے پیش کیا ہے حالی کی تصویر اس سے زیادہ مختلف نہیں - آب حیات سے غالب کی شخصیت کا جو تصور قائم ہوتا ہے حالی کی کتاب زیادہ ضخیم ہونے کے باوجود اس میں اضافہ نہیں کرتی - کلام غالب کی بنیادی خصوصیات میں بھی آب حیات کی آرا کا سایہ پڑتا دکھائی دیتا ہے - یہاں مرزا کے قلم کے وہی نقوش زیادہ توجہ کا باعث ہوئے ہیں جن کی نشاندہی آزاد نے کر دی ہے - مثلاً آزاد کہتے ہیں :

> ان خطوط کی عبارت ایسی ہے گویا آپ بیٹھے گل افشانی کر رہے ہیں...ان خطوط کی طرز عبارت بھی ایک خاص قسم کی ہے ، ظرافت کے چٹکلے اور لطافت کی شوخیاں اس میں خوب ادا ہوسکتی ہیں - یہ انہی کا اعجاز تھا کہ آپ مزا لے لیا اور اوروں کو لطف دے گئے ، دوسروں کا کام نہیں - اگر کوئی چاہے کہ ایک تاریخی حال ، یا اخلاقی خیال ، یا علمی مطالب ، یا دنیا کے معاملات خاص میں مراسلے لکھے تو اس انداز میں ممکن نہیں - اس کتاب میں چونکہ اصلی خط لکھے ہیں اس لیے وہ ان کی ظاہر و باطن کی حالت کا آئینہ ہے - اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے غم و الم ہمیشہ انہیں ستاتے تھے اور وہ علو حوصلہ سے ہنسی میں اڑاتے تھے - پورا لطف ان تحریروں کا اس شخص کو آتا ہے کہ جو خود ان کے حال سے اور مکتوب الیہوں کی چال ڈھال سے اور طرفین کے ذاتی معاملات سے بخوبی واقف ہو - غیر آدمی کی سمجھ میں نہیں آتیں - اس لیے

اگر ناواقف اور بے خبر لوگوں کو اس میں مزا نہ آئے
تو کچھ تعجب نہیں[۸۴] ۔

مرزا کثیرالاحباب تھے دوستوں سے دوستی کو
ایسا نباہتے تھے کہ اپنایت سے زیادہ ان کی دوست پرستی
خوش مزاجی کے ساتھ رفیق ہو کر ہر وقت ایک دائرہ
شرفاء اور رئیس زادوں کا ان کے گرد دکھاتی تھی؛
انہی سے غم غلط ہوتا تھا، اسی میں ان کی زندگی تھی۔
لطف یہ کہ دوستوں کے لڑکوں سے بھی وہی باتیں
کرتے تھے جو دوستوں سے۔ ادھر ہونہار نوجوانوں کا
مؤدب بیٹھنا، ادھر سے بزرگانہ لطیفوں کا پھول برسانا،
اُدھر سعادت مندوں کا چپ مسکرانا اور بولنا تو حد
ادب سے قدم نہ بڑھانا، ادھر پھر بھی شوخئی طبع سے
باز نہ آنا۔ بہر حال انھیں لطافتوں اور ظرافتوں میں
زمانے کی مصیبتوں کو ٹالا اور اور ناگوار کو گوارا کر
کے ہنستے کھیلتے چلے گئے[۸۵]۔ معنی آفرینی اور نازک
خیالی ان کا شیوۂ خاص تھا[۸۶]۔ وہ اپنا انداز سب سے
الگ رکھنا چاہتے تھے۔ لباس ان کا اکثر اہل ولایت کا
ہوتا تھا . . . وہ فارسی نویسی کو نہ فقط ذوق بلکہ
عشق دلی کے ساتھ نباہتے تھے اور لباس اور گفتار کی
کچھ خصوصیت نہیں وہ اپنی قدامت کی ہر بات سے محبت
رکھتے تھے، خصوصاً خاندان کے اعزازوں کو ہمیشہ
جانکاہ عرق ریزیوں کے ساتھ بچاتے رہے[۸۷]۔

آزاد کی ان تحریروں کے چھینٹے یادگار غالب میں ملاحظہ
فرمائیے:

اداے مطلب کا طریقہ بالکل ایسا ہے جیسے دو آدمی بالمشافہ بات چیت یا سوال و جواب کرتے ہیں[۸۸]۔

مرزا کی طرز تحریر کی جو خصوصیتیں اوپر مذکور ہیں یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ اور لوگ اس کی پیروی نہ کرسکیں۔ وہ چیز جس نے ان مطائبات کو نوول اور ڈراما سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے وہ شوخئی تحریر ہے۔ . . مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی جیسے ساز کے تار میں سر بھرے ہوئے ہوتے ہیں . . . مرزا خط لکھتے وقت ہمیشہ اس بات کو نصب العین رکھتے تھے کہ خط میں کوئی ایسی بات لکھی جائے کہ مکتوب الیہ اس کو پڑھ کر محظوظ اور خوش ہو۔ پھر جس رتبے کا مکتوب الیہ ہوتا تھا اس کی سمجھ اور مذاق کے موافق خط میں شوخیاں کرتے[۸۹]۔ الغرض مرزا کے خطوط اور رقعات میں ایسے خطوط کم نکلیں گے جن میں اس قسم کی ظرافت اور ہنسی کی باتیں مندرج نہ ہوں، یہاں تک کہ رنج و افسردگی کا بیان بھی اسی قسم کی چھیڑ سے خالی نہ ہوتا تھا[۹۰]۔

مرزا. . معمولی اسلوبوں سے تا بمقدور بچتے رہتے تھے اور شارع عام پر چلنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے وہ، بہ نسبت اس کے کہ شعر عام فہم ہو جائے، اس بات کو زیادہ پسند کرتے تھے کہ طرز خیال اور طرز بیان میں جدت اور نرالا پن پایا جائے . . . مرزا کی طبیعت اس قسم کی واقع ہوئی تھی، وہ عام روش پر چلنے سے

ہمیشہ ناک چڑھاتے تھے ۔ وہ خست شرکا کے سبب خود شاعری سے نفرت ظاہر کرتے تھے ، عامیانہ خیالات اور محاورات سے ، جہاں تک ہو سکتا تھا، اجتناب کرتے تھے [۹۱] ۔

اسی طرح مواد کے انتخاب میں بھی حالی نے دو چار جگہ فائدہ اٹھایا ہے اور غالب کے وہ اقتباسات درج کیے ہیں جو آزاد بھی کر چکے تھے ۔ مثلاً : بادشاہ سے ماہ بماہ تنخواہ کے تقاضے والا قطعہ[۹۲] یا حاتم علی مہر کا[۹۳] خط ۔

(۱۰)

آزاد کا اثر و نفوذ یادگار غالب پر اتنا واضح ہے کہ اسے محض اتفاق کہہ کر نہیں ٹالا جا سکتا ۔ حالی کی جلد بازی نے انھیں اپنے مواد کی مزید چھان بین ، غالب کی تحریروں کے گہرے مطالعے (خاص کر فارسی خطوط) اور احباب سے فراہمئی مواد میں مزید تگ و دو سے باز رکھا ۔ وہ غالب کے خاص حلقۂ احباب میں نہ سہی ، حیات سعدی میں انھوں نے جس محنت اور دیدہ ریزی کا ثبوت دیا ہے، یادگار میں اگر اس کا تھوڑا حصہ بھی صرف کرتے تو ہمیں اس سے بہتر تصنیف بھی دے سکتے تھے ۔

— —

حواشی

١ - یادگار غالب صفحہ ٣ -
٢ - ایضاً صفحہ ۴ -
٣ - The Truth about the Khilafat : compiled by Kazi Siraj-ud-Din Ahmad Bar-at-Law Rawalpindi. (1916)
۴ - یادگار صفحہ ٣٧٥ -
٥ - ایضاً صفحہ ٧ ، ٨ و ٣٧٦ -
٦ - ایضاً غالب صفحہ ۴ -
٧ - ایضاً صفحہ ٣ -
٨ - ایضاً صفحہ ٢۴٢ -
٩ - ایضاً صفحہ ٣٣٢ -
١٠ - ایضاً صفحہ ۴ -
١١ - ایضاً صفحہ ٢۴٩ -
١٢ - ایضاً صفحہ ٢٩١ -
١٣ - ایضاً صفحہ ٣٠٠ -
١۴ - ایضاً صفحہ ٣٦٦ -
١٥ - ایضاً صفحہ ١٧ -
١٦ - ایضاًصفحہ ٥۴ -
١٧ - ایضاً صفحہ ١ -
١٨ - ایضاً صفحہ ١٨١ -
١٩ - ایضاً صفحہ ١٨١ -
٢٠ - ایضاً صفحہ ۴٦ ، ۴٧ -
٢١ - ایضاً صفحہ ٥٢ -
٢٢ - ایضاً صفحہ ٨٩ -
٢٣ - یادگار غالب صفحہ ٩٠ -
٢۴ - تذکرۂ حالی - محمد امین زبیری صفحہ ٣ -
٢٥ - نادرات غالب مرتبہ آفاق صفحہ ٩٧ تا ١٠٠ -
٢٦ - حوالوں کے لیے دیکھیے راقم کے ترتیب دیے ہوئے مقدمۂ شعر و شاعری کے حواشی صفحہ ۴١ تا ۴٣ -
٢٧ - اردوے معلیٰ صفحہ ٢٧ -
٢٨ غالب - مہر صفحہ ١۴١ -
٢٩ - زندگانی بے نظیر صفحہ ٣٠١ طبع لکھنئو ١٩٠٠ء -
٣٠ - غالب - مترجم سید معین الدین قریشی طبع ١٩٣٢ء صفحہ ۴٨ ، ۴٩ -
٣١ - غالب نامہ (جز اول ، آثار غالب) شیخ محمد اکرام صفحہ ١٥٩ -
٣٢ - ایضاً صفحہ ١٧٧ -
٣٣ - ایضاً صفحہ ١٣٢ -
٣۴ - ایضاً صفحہ ٩٢ -
٣٥ - ایضاً صفحہ ٩٥ -

۳۶ - ایضاً صفحہ ۱۰۱ -

۳۷ - نادرات غالب ، آفاق
صفحہ ۶۰ ، ۶۱ -

۳۸ - ایضاً صفحہ ۶۴ -

۳۹ - ذکر غالب - مالک رام -
طبع ثانی اکتوبر ۱۹۵۰ء
جید پریس دہلی صفحہ ۹۱ -

۴۰ - The Spirit and Substance of Urdu Prose. Dr. S.M. Abdullah
pp. 86, 87

۴۱ - غالب ، مہر صفحہ ۴۱ -

۴۲ - ایضاً صفحہ ۸۲ -

۴۳ - ایضاً - مفصل بحث صفحہ
۹۱ تا ۹۳ -

۴۴ - غالب - مہر صفحہ ۹۳

۴۵ - ایضاً صفحہ ۹۴ ، ۹۵

۴۶ - ایضاً صفحہ ۴۸ -

۴۷ - ایضاً صفحہ ۱۶۴ تفصیل
کے لیے ایضاً - صفحہ ۲۱۲ -
۲۱۳ -

۴۸ - ایضاً صفحہ ۱۶۵ -

۴۹ - ایضاً صفحہ ۱۸۸ ، ۱۸۹ -

۵۰ - ایضاً صفحہ ۲۱۲ -

۵۱ - ایضاً صفحہ ۳۷۴ - ۳۷۵ -

۵۲ - ایضاً صفحہ ۳۷۵ ، ۳۷۶ -

۵۳ - ایضاً صفحہ ۳۴۳ -

۵۴ - ایضاً صفحہ ۳۶۹ -

۵۵ - متفرقات غالب، سید مسعود
حسن رضوی ، ہندوستانی
پریس رامپور ۱۹۴۷ء -
مقدمہ ، صفحہ ۱۷ تا ۲۶ -

۵۶ - احوال غالب ، (مقالہ)
ہرمزد ثم عبدالصمد - قاضی
عبدالودود -
صفحہ ۲۵۰ -

۵۷ - تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو
مذکورہ بالا مقالہ صفحہ
۲۳۶ تا ۲۴۶ ،نیز نقد غالب،
(مقالہ)غالب بہ حیثیت محقق،
قاضی عبدالودود
صفحہ ۳۳۹ تا ۳۵۸ -

۵۸ - نقد غالب ، صفحہ ۳۶۸ تا
۳۸۲ -

۵۹ - ایضاً ۳۸۲ تا ۴۲۵ - اس
میں غالب کی ایسی سو
اغلاط کی نشان دہی کی ہے
جو فارسی سے متعلق ہیں -

۶۰ - ایضاً مقالۂ ودود ، صفحہ
۵۲۴ تا ۵۳۲ -

۶۱ - ڈاکٹر شوکت سبزواری
فرماتے ہیں کہ یہ مصرعہ
بالکل موزوں ہے - غالب
نے (ہ) کو دبا دیا ہے اور
اس کی مثالیں اساتذہ کے
کلام میں بہت ہیں -

۶۲ - نقد غالب - مقالۂ قاضی عبدالودود ، صفحہ ۵۳۳ تا ۵۳۵ -

۶۳ - مکاتیب غالب ، مرتبہ عرشی صفحہ ۸۶ ، فٹ نوٹ -

۶۴ - تحقیقی مطالعے - ڈاکٹر نذیر احمد ، ص ۲۴ -

۶۵ - بحوالہ مکتوب غالب بنام تفتہ ، خطوط غالب ص ۲۱۴ -
نگار پاکستان - نوادر غالب - نثار احمد فاروقی ، نومبر ۱۹۶۴ء ص ۴۵ -

۶۶ - اوریئنٹل کالج میگزین - مذہب غالب ، مقالہ سید اولاد حسین شاداں بلگرامی - جلد ۸ ، عدد ۳ ، عدد مسلسل ۲۹ - مئی ۱۹۳۲ء صفحہ ۱۶۳ بیعد -

۶۷ - یادگار غالب ، صفحہ ۳۷۸ -

۶۸ - ایضاً ، صفحہ ۲ -

۶۹ - ایضاً ، صفحہ ۱۷۱

۷۰ - ایضاً ، صفحہ ۱۷۲ -

۷۱ - ایضاً ، صفحہ ۱۸ -

۷۲ - ایضاً صفحہ ۶۳ -

۷۳ - Ham, Hog -

۷۴ - انتخاب غالب ، صفحہ ۴۱ تا ۴۳ -

۷۵ - یادگار غالب ، صفحہ ۳۷۷ -

۷۶ - آب حیات ، صفحہ ۵۱ -

۷۷ - ایضاً ، صفحہ ۵۱۴ -

۷۸ - ایضاً ، صفحہ ۵۱۶ -

۷۹ - ایضاً ، صفحہ ۵۱۸ -

۸۰ - یادگار غالب صفحہ ۱۰۱ -

۸۱ - ایضاً ، صفحہ ۳۱۱ -

۸۲ - ایضاً ، صفحہ ۳۹۰ -

۸۳ - ایضاً ، صفحہ ۳۹۰ ، ۲۹۳ -

۸۴ - آب حیات ، صفحہ ۵۱۹ -

۸۵ - ایضاً ، صفحہ ۵۱۱ -

۸۶ - ایضاً ، صفحہ ۵۱۵ -

۸۷ - ایضاً ، صفحہ ۵۰۷ -

۸۸ - یادگار غالب ، صفحہ ۱۵۸ -

۸۹ - ایضاً ، صفحہ ۱۶۰ -

۹۰ - ایضاً ، صفحہ ۱۶۷ -

۹۱ - ایضاً ، صفحہ ۱۰۳ ، ۱۰۴ -

۹۲ - آب حیات ، صفحہ ۵۲۷ -
یادگار غالب ، صفحہ ۱۵ -

۹۳ - آب حیات ، صفحہ ۵۰۶ ، ۵۰۷ یادگار غالب ، صفحہ ۱۶۶ -

غالب اور اس کا ماحول

(۱)

غالب کی ''انا'' شعری تصورات ، عشقیہ روایات اور عام زندگی کے مظاہر میں نمودار ہوتی ہے - ان کی اُردو شاعری کا بیشتر سرمایہ تیس برس کی عمر تک مکمل ہو چکا تھا اور اس کے بعد اس میں قلیل اضافہ ہوا - مرزا کی فارسی شاعری کا آغاز پچیس برس کی عمر کے قریب ہوا لیکن اس میں غالب حصہ قیام کلکتہ کے بعد کی یادگار ہے - اُردو کلام کو عنفوان شباب کا اور فارسی شاعری کو بعد کے ادوار کا حاصل سمجھنا چاہیے - فارسی شاعری میں ان کے مزاج کی ہمواری اور استواری کے نشان زیادہ ملتے ہیں - ابتدائی اُردو کلام میں ان تماثیل اور استعارات و تشبیہات کی کثرت ہے جو بیدل اور صائب، ناصر علی، جلال اسیر وغیرہ کا سرمایۂ خاص ہیں - آئینہ، طوطی ، آسیہ ، سیلاب ، پنبہ ، پروانہ ، شمع ، لگن ، سرو چراغاں ، شعلہ و آتش ان کی فکری متاع کے اظہار کے خارجی پیرائے ہیں - غالب سے قبل کا ادبی ماحول دراصل زندگی اور اس کے اظہار کے مخصوص سانچوں کا دور ہے - جب تحریک شعری ایک پیچیدہ فکری نظام سے متصادم اور مرتے ہوئے معاشرے کی افتاد سے نبرد آزما اور خارج از ذات وہمی اور حسی تشبیہوں کے تار و پود کو بنانے سنوارنے میں مصروف تھی - ایسے میں کہ خارجی زندگی مثبت عمل سے محروم ہو رہی تھی - عمل و حرکت کا واحد وسیلہ غیر ذات کا ادراک اور معاشرے کے تصوراتی اور مثالی نمونے کے بیان تک محدود ہو کر رہ گیا تھا - بیدل کے مابعدالطبعیاتی تصورات غنی کاشمیری کے اخلاقی درس اور صائب کی مقولہسازی کی تہہ میں

خارجی زندگی کی بے پناہ یورش سے بچ نکلنے کا رجحان قوی ہے۔ یہ اخلاقی درس و تدریس سعی و عمل کو یا تو فرد کی روحانی ترقی پر صرف کرنے کے کام آ رہی تھی یا پھر زندگی کی خارجی بے عملی کو داخلی عمل کے واسطے سے پہچاننے کی مجبوری قرار دی جا سکتی ہے۔ ان شعرا میں بیدل زیادہ بیدار شعور کا مالک ہے، لیکن بیدل کا زندگی کے وجود کو عمل اور حرکت کے پیمانوں میں پیش کرنے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ وہ دراصل ایک ایسے آدرشی معاشرے کی نشان‌دہی کر رہا ہے جس کا رشتہ خارج سے بہت کمزور ہو چکا ہے۔ معاشرتی زندگی کی یہ تصویر درحقیقت خارج میں اپنا وجود کھو چکی ہے۔ اس کا عمل اور اس کی قوت نمو کا دائرۂ کار محض در و دیوار کا تحرک اور اس کا اضطراب فقط سیلاب کا اضطراب ہے۔ سیلاب و آسیا کے استعارے انسانی زندگی کو کائنات سے الگ کرکے انسان کو مجبوری و بے چارگی کے ساحل پر لا کھڑا کرتے ہیں۔ طوطی و آئینہ زندگی کی متصوفانہ توجیہہ کے علاوہ حیرت و حیرانی کا استعارہ ہے۔ یہ حیرت ، یہ حیرانی روحانی ارتقا کا اشارہ ہی نہیں خارجی زندگی کی حیرت و حیرانی کا ایک داخلی جواز بھی ہے۔ اس خوفناک صورت حال کو بیدل جیسے حساس اور بیدار شاعر نے جب اپنی گرفت میں لیا تو اس کی تصویرکاری حقیقی زندگی کا بدل ہو کر رہ گئی۔ انسان کی قوت تسخیر حقیقی زندگی میں قابل عمل نہ تھی۔ تخیلی زندگی میں اس کے لیے متحرک تصاویر و تماثلات کا مرکز بن گئی۔ حیرت و حیرانی کی یہ حالت انسان کو گرد و پیش پر نگاہ ڈالنے پر مجبور کرتی ہے تو اس کے کام وہ ذخیرۂ الفاظ آتا ہے جس کا تعلق انسانی نظر کے ساتھ ہے۔ دیدہ و نگاہ کی کافر سامانیوں کے وسیلے سے متحرک تصاویر (Motor Imagery) شاعر کی کارگاہ خیال میں نمودار ہوتی ہیں۔ غالب کے ہاں بھی دید ،

دیدہ ، عید نظارہ، جلوہ گل ، دیدۂ یعقوب ، چشم حسود ، نگاہ آفتاب، بہار نظارہ کی کثرت اسی فکری سانچے میں خلق ہوئے ہیں ۔ انسان اپنی ذات کو خارجی عوامل کے وسیلے سے پہچانتا ہے ۔ غالب نے بھی جس مخصوص ماحول میں ایغو (Ego) کی تشکیل کی ، اس میں ان شعری روایات کا حصہ بھی ہے جو غالب کے زمانے سے قبل کی ادبی فضا میں زندہ تھیں اور جن میں خود غالب نے پرورش پائی ۔ غالب زندگی کی حرکت اور عمل کو بیدلیت کی سطح سے دیکھتا ہے جس میں شعری تمثالات (Images) کا تحرک خارجی زندگی کی بے عملی کی تلافی کرتا ہے ۔ غالب کی یہ تلافی خارجی حالات کے خلاف شدید مقاومت کا داخلی بیان ہے :

بلا سے ہیں جو یہ پیش نظر در و دیوار
نگاہ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار
وہ آ رہا مرے ہمسائے میں تو سائے سے
ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار
نہ پوچھ بے خودیٔ عیش مقدم سیلاب
کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار
آمدِ سیلاب طوفانِ صدائے آب ہے
نقش پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ ہے

عمل اور حرکت سے متعلق ذخیرۂ الفاظ کی کثرت غالب کی ''انا'' کو مثبت راستوں پر بھی گامزن کرتی ہے ۔

(۲)

مرزا کی ابتدائی زندگی ایک یتیم بچے کی زندگی ہے جو کبھی چچا کے ہاں پرورش پاتا ہے ، کبھی نانا کے دسترخوان کا زلہ ربا

ہے ، کبھی سسرال کا دست نگر ہے ۔ اپنی ذات کی حفاظت کے لیے نئے نئے حصار تعمیر کرنے کی ضرورت بہر حال ہر انسان کو پڑتی ہے ۔ غالب کی ''انا'' اپنے حقیقی زمانے سے نکل کر ماضی کی طرف رجوع کرتی ہے تو اجداد کی عظمت کا احساس انہیں کچھ زیادہ ہی شدت پر مجبور کرتا ہے ۔ وہ جس متوسط طبقے میں پیدا ہوئے اس کے لیے ان کی پنشن کافی تھی ، لیکن وہ اس پر قانع نہیں ہوئے ۔ عمر بھر انہیں اپنے اجداد بعید کی عظمت ، خاندان کی قدیم دولت ، رتبے کی از دست رفتہ وقعت اور شان و شوکت کا بہت پاس رہا ۔ اس دھندے میں ان کی اپنی مالی حالت ابتر ہوتی چلی گئی ۔ آخر عمر تک وہ معاشرے میں اپنی اصلی حیثیت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے ۔ اس سے ان کی زندگی اور ان کی آرزو کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا ۔ یہی ان کی بدنصیبی کا سبب بھی ہے اور اسی میں ان کی عظمت کا راز بھی مخفی ہے ۔

آرزو کو بلند سے بلند تر مقام پر فائض کرتے ہوئے مثبت حالت میں غالب اپنی ''انا'' کے لیے اعتماد کی دولت ، طنز و مزاح کی چاشنی اور نشاطیہ کیفیات کی جلوہ گری کو نفسی توانائی کے لیے ایک حفاظتی والو (Safety valve) کے طور پر استعمال کرتے رہے ۔ اس مثبت روش سے ان کی شاعری میں خلوص و اعتماد ، زندگی پر گہری نظر ڈالنے اور تجربات کی نوعیت متعین کرنے ، کٹھن حالات میں زندگی کو بسر کرنے کا شعور ، اپنے تجربات کو معروضی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی سکت آ گئی :

دھمکی میں مر گیا جو نہ باب نبرد تھا
عشق نبرد پیشہ طلبگار مرد تھا

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولیٔ انداز و ادا میرے بعد

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

دیکھو تو دل‌فریبی انداز نقش پا
موج خرام ناز بھی کیا گل کتر گئی

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

غالب کی شخصیت کی تشکیل میں ان کے حسب نسب نے بہت حصہ لیا ہے۔ ان کے اجداد ترک تھے، بے دل کے اجداد بھی ترک تھے، امیر خسرو بھی ترک تھے، ابوظفر بہادر شاہ کے آبا و اجداد بھی ترک۔ غالب کی اس پسند کے دوسرے عوامل بھی یقیناً ہوں گے لیکن غالب کو ان شخصیتوں سے ایک لگاؤ تھا۔ دیگر شخصی اور غیر شخصی عوامل کے علاوہ ان کی پسند کا رخ متعین کرنے میں اس مناسبت کو بھی دخل معلوم ہوتا ہے۔ وہ پاک و ہند کے فارسی شاعروں میں صرف خسرو کو سند مانتے ہیں۔ آخر کیوں؟ وہ ہندی نژاد شاعروں میں سے بیدل کی طرز کو اپناتے ہیں اور اس پر فخر بھی کرتے ہیں۔ آخر کس لیے؟ وہ بادشاہوں کی تعریف کو بھٹئی گری جانتے ہیں، لیکن ابوظفر بہادر شاہ کی تاریخ نویسی کی خدمت کو محض سرکاری نوکری کے طور پر نہیں بجا لاتے بلکہ اس کے وسیلے سے ترکوں کے نظریۂ تاریخ کو بیان کرتے ہیں اور اپنے نسلی تعصب کے بھرپور اظہار سے بھی

باز نہیں آتے؟ - مہر نیم روز صرف مغلیہ تاریخ ہی نہیں ترکوں کے علم الانساب کی دستاویز اور غالب کے تعصب نسلی کی واضح شہادت بھی ہے - غالب کے ان اثرات کو قبول کرنے میں دوسرے عناصر کو بھی دخل ہوگا، لیکن اپنے مزاج سے ہم آہنگی کے لیے انہوں نے ان اثرات کا ایک داخلی رشتہ اپنی ذات سے بھی استوار کیا - نسلی برتری پر فخر و ناز غالب کے مزاج کا خاصہ ہے -

محمد شاہی عہد میں غالب کے دادا دلی میں وارد ہوئے - وہ ترکی جانتے تھے لیکن اس کے بعد محمد شاہ فرماں روائے عہد کی طرح اس خاندان پر بھی ترکی تمام ہو گئی - فارسی زبان اور مقامی روایات نے خاندان کی تربیت کی - غالب تک آتے آتے آبائی وراثت کا تھوڑا حصہ باقی رہا تھا - غالب کی تربیت جس معاشرے میں ہوئی وہ آگرے اور دلی کی فضا ہے - اس میں ابھی فارسی کی ساکھ باقی تھی - غالب نے اسی فضا میں آنکھ کھولی اور فارسی اور اُردو کے علمی و ادبی سرمائے سے استفادہ کیا - اس زمانے میں فارسی ادب میں دو مکتبہ ہائے خیال موجود تھے - ہندی ایرانی نزاع نے مقامی اور ایرانی کا امتیاز قائم کیا - غالب کے حلقۂ احباب میں نواب حسام الدین حیدر کا گھرانا اثر انداز معلوم ہوتا ہے - شاید اسی خانوادے کے زیر اثر غالب اپنے آبائی فرقے کو چھوڑ کر شیعیت کی طرف راغب ہوئے - غالب مقامی سے زیادہ ایرانی عناصر کے والہ و شیدا تھے - ان کے شعری نظریات پر اس نقطۂ نظر کا نمایاں اثر ہے - ایران پرستی کلکتے ہیں جا کر اور بھی تیز ہوئی - جب وہاں ہندی دبستان کے شیدائی غالب کے فارسی کلام پر معترض ہو گئے - غالب کی انا نے اس کا انتقام یوں لیا کہ آئندہ کے لیے اُردو کو تقریباً ترک کرکے فارسی شاعری میں عمر کا بیشتر زمانہ

صرف کر دیا ۔ وہ اُردو کی بجائے فارسی پر ناز کرتے ہیں :

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگ من است

انہیں فرزند آذر کہلانے پر بھی فخر ہے ۔ اور دینِ بزرگاں سے گریز ان کے نزدیک ایک اعلیٰ قدر ہے :

با من میاَمیز اے پسر ، فرزند آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر، دینِ بزرگاں خوش نکرد

ایران کی طرف رغبت کا یہ مسلک صرف مذہبی عقاید کی حد تک نہیں ۔ غالب نے اسے زندگی کے جملہ پہلوؤں پر طاری کر رکھا ہے ۔ اُردو اور فارسی کلام میں آگ اور اس کے متعلقات کی کثرت غالب کے فکری نظام میں بہت دور تک جاتی ہوئی نظر آتی ہے ۔ شمع ، شعلہ ، زبانہ ، لالہ ، خون ، ناخن ، خونِ شہیداں ، بسمل ، دستِ حنا ۔ سرخ رنگ سے یہ لگاؤ غالب کی زندگی کے بعض جذباتی پہلوؤں کی وضاحت کرتا ہے :

ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہری قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
کہ مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو وہ اگر شرار ہوتا

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ‌جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا
نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

اہل تدبیر کی واماندگیاں
آبلوں میں بھی حنا باندھتے ہیں

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے بھی
....

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

مجھے اب دیکھ کر ابر شفق آلودہ یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

بجز پرواز شوق ناز کیا باقی رہا ہوگا
قیامت اک ہوائے تند ہے خاک شہیداں پر

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجت رفو کیا ہے

اچھا ہے سر انگشت حنائی کا تصور
دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

وہ تپ عشق تمنا ہے کہ پھر صورت شمع
شعلہ تا نبض جگر ریشہ دوانی مانگے

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہوتے تک

دل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب
اس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

عشرت قتل گہ اہل تمنا مت پوچھ
عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

موج خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستان یار سے اٹھ جائیں گیا

بزم ترا شمع و گل خستگی بوتراب
ساز ترا زیر و بم واقعۂ کربلا

بے خود بوقت ذبح تپیدن گناہ من
دانستہ دشنہ تیز نکردن گناہ کیست

عجب نشاط سے جلاد کے، چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سائے سے سر پانو سے ہے دو قدم آگے

جز زخم تیغ ناز نہیں دل میں آرزو
جیب خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے

(۳)

غالب کے ہاں بعض الفاظ بڑی اہمیت رکھتے ہیں - رنگوں
میں ان کی Fixation سرخ سبز اور سیاہ رنگ کے ساتھ ہے - ان

میں سرخ و سیاہ کو بہت اہمیت ہے۔ خون اور اس کے متعلقات کا غالب کی جنسی زندگی سے کیا رشتہ ہے؟ ان کی جنسی زندگی کی تفصیلات معلوم نہیں اس لیے ان علامتی الفاظ کے جنسی سیاق و سباق سے قطع نظر شہدائے کربلا کی شہادت اور اپنی مظلومی کے درمیان معنوی رشتے کی تلاش و جستجو غالب کو سرخ رنگ سے وابستہ رکھتی ہے۔ غالب کی خود رحمی کی یہ ایک رفیع صورت ہے جس میں وہ اپنی زندگی کے معمولی واقعات کو واقعات کربلا سے مماثل کر دکھاتے ہیں۔ شہادت، خون شہیداں، بسمل کے تلازمات غالب کے ذاتی کرب کا وہ اظہار ہے جس کی جھلکیاں ہمیں لکھنوی دبستان کے شعرا کی غزلوں میں ملتی ہیں۔ لیکن غالب کی سرخ رنگ سے چسپیدگی اس کے علاوہ بھی توجہ طلب نکات رکھتی ہے۔ ان کے ہاں سرخ رنگ کا ایک رشتہ سیاہ رنگ کے ساتھ بھی ہے۔ وہ سرخ کو سیاہ میں تبدیل ہوتے دیکھتے ہیں۔ سرخی کا انجام روشنی نہیں تاریکی ہے۔ لہو کا شہادت تک، بسمل کا مرگ تک، حنا کا داغ تک، گل لالہ کی چمک دمک کا داغ لالہ سے، روشنی کا دھوئیں سے ربط اور خون کا تاریکی سے ایک سلسلہ قائم ہے:

ہزاروں دل دیے جوش جنون عشق نے مجھ کو
سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں

سایہ میرا مجھ سے مثل دود بھاگے ہے اسد
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

یک ذرۂ زمیں نہیں بے کار باغ کا
یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا

شمع کی لو غالب کو اس لیے اچھی لگتی ہے کہ وہ بالآخر

بجھ جاتی ہے یا جل جاتی ہے۔ بجھنا اور جل کر رہ جانا غالب کے نزدیک ہر زندہ کا مقسوم اور ہر التہاب کا انجام ہے:

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا

بوے گل، نالۂ دل، دود چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہوتے تک

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

سایے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس قد دلکش سے جو گلزار میں آوے

نفس قیس کہ ہے چشم و چراغ صحرا
گر نہیں شمع سیہ خانۂ لیلی نہ سہی

شعلہ سے نہ ہوتی ہوس شعلہ نے جو کی
جی کس قدر افسردگیٔ دل پہ جلا ہے

قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ
اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے؟

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

جی جلے ذوق فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں ؟
ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے
آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے[۲]

محبوب کے سراپے میں بھی انھی رنگوں کی آمیزش غالب کے لیے دلجمعی کا سامان ہے ۔ ان کی ''انا'' اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ وہ اپنے کلام میں محبوب کے پیکر سے انسانی اور گوشت پوست کا تعلق رکھتے ہوئے بھی اس کی پوری تصویر قاری کو کبھی نہیں دکھاتے۔ کبھی کبھی تو محبوب غالب کی ذات کی Projection کا روپ دھار لیتا ہے ۔ یہ محبوب خارجی وجود رکھتا ہے اس کے جسمانی پہلو اور حرکات و سکنات غالب کو مرغوب ہیں ۔ اس کے خرام ناز ، اس کے اعضا ، اس کی نزاکت اور حیاداری ، اس کا چہرہ ، اس کے گال ، اس کی زلفیں اس کی آنکھیں ، غالب کو پسند ہیں - وہ اس کے شباب کی دل آویزی کے بھی قدردان ہیں ۔ لیکن کلام غالب کی مدد سے اگر آپ غالب کی محبوب کی تصویر بنانا چاہیں تو وہ از حد دھندلی اور مبہم ہے[۳] - غالب عشق و محبت میں اپنی ذات کو پیش نظر رکھتے ہیں - وہ محبوب کے سراپے سے زیادہ اس کے بارے میں تعمیمی رویے کو اہم جانتے ہیں ۔ محبوب کے احساسات کو بیان کرنے کی بجائے محبوب کو محض اپنے داخلی کوائف کے مہیج کے طور پر استعمال کرتے ہیں ۔ ان کی ''انا'' آپ اپنی رقیب بھی ہو جاتی ہے :

کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر

وا کر دیے ہیں شوق نے بند قبائے حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

ابھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں ولے ان کی تمنا نہیں کرتے

پھر بے خودی میں بھول گیا راہ کوئے یار
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

اسی سیاہی کی وجہ سے غالب کو خط (نامہ)، نامہ بر ، نامہ وغیرہ سے بھی تعلق خاطر ہے :

سیاہی جیسے گر جاوے دم تحریر کاغذ پر
مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

غالب کا محبوب اس کے جذبات و ہیجانات کا عکس ہے ۔ اس عکس میں غالب اپنا چہرہ دیکھتے رہتے ہیں ۔ ایسے میں وہ صرف وہی نقش ابھارتے ہیں جو ان کے ذاتی میلانات سے مطابقت رکھتے ہیں ۔ انہیں سرخ رنگ پسند ہے ۔ یہ سرخ رنگ اپنی رو بہ تغیر صورت میں سیاہ رنگ میں تبدیل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے ۔

غالب محبوب میں بھی سرخ و سیاہ کی فراوانی تلاش کرتے ہیں ۔ خون بسمل ، پنجۂ مرجاں ، شرار و سنگ بھی علامتی حیثیت رکھتے ہیں ۔ فرد کی جذباتی زندگی سے ایک سے زیادہ رشتے

علامت کا بنیادی وصف ہے ۔ یہاں بھی ان علامات کے کئی رخ ہو سکتے ہیں ۔ لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ ان کا ایک غیر محسوس رشتہ متضاد رنگ یعنی سیاہی سے بھی ہے ۔ خون بسمل کا شہادت سے، موت کا قبر سے ، لالے کا داغ سے ، دل کا داغ دل اور سویدائے دل سے ، نرگس کا چشم سے مردمک چشم کی مناسبت سے ، خوشی کا غم سے ، نشاط کا رنج سے ایک ایسا رابطہ ہے کہ غالب اکثر دونوں حالتوں کا ایک ساتھ ذکر کرتے ہیں ۔ غالب کی ایران پرستی ثنویت کے جس پیچاک میں اسیر ہے اسی کا لازمی رشتہ تقابل اور تضاد کی اس دھوپ چھاؤں کے ساتھ ہے ۔ غالب سرخ رنگ کو اس لیے عزیز رکھتے ہیں کہ اس میں سیاہ رنگ میں تحلیل ہو جانے کی صلاحیت ہے ۔ اس لحاظ سے سرخ و سیاہ کا یہ باہمی ربط جنسی زندگی کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔ روشنی انہیں عزیز ہے کہ وہ تاریکی سے دست و گریباں ہے ۔ جنسی روابط کا مرکز سرخی سے سیاہی کی طرف ایک علامتی سفر ہے اور غالب کا کلام ان کی زندگی کے اس پہلو کا عکاس ہے :

رخسار یار کی جو کھلی جلوہ گستری
زلف سیاہ بھی شب مہتاب ہو گئی

موج تبسم لب آسودۂ مسی
میرے لیے تو تیغ سیہ تاب ہو گئی

ان جنسی علامتوں کا تعلق غالب کے تہذیبی افق سے بھی ہے ۔ ان کے ہاں یہ علامات اپنے تضاد کی وجہ سے بھی غالب کے لیے پرکشش ہیں ۔ ایران دوستی ان کے تصورات کی متضاد کیفیتوں کو ایک لڑی میں پرو دیتی ہے ۔ غالب کے تصورات حسن عشق

بھی روائتی راستوں سے ہٹ کر ''انا'' کے داخلی مسائل سے ہم آہنگ ہیں - فارسی اور اُردو کے مروجہ تصورات حسن کو خیر باد کہہ کر غالب محبوب میں سرخ و سیاہ کے ڈانڈے یوں بھی ملاتے ہیں کہ ان کا محبوب روائتی محبوب کی بجائے ایک ستم پیشہ ڈومنی ہو جاتا ہے - کیا غالب کے ہاں محبوب کا رنگ ان کے نفسی رجحانات کا مرکزی نقطہ ہے؟ یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا ، لیکن بظاہر حقیقت یہی معلوم ہوتی ہے :

رچ گیا جوش صفاے زلف کا اعضا میں عکس
ہے نزاکت جلوہ ، اے ظالم سیہ فامی تری

غالب کا تصور محبوب سیاہی اور تاریکی سے کسب حسن کرتا ہے - غالب کو محبوب کی زلفیں اس لیے عزیز ہیں کہ وہ سیاہ رنگ کی ہیں - مژگان بھی سیاہ ہیں ، آنکھ کی پتلی سیاہ ہے ، سایہ بھی سیاہ ہے ، چشم دنبالہ دار بھی اپنی سیاہی کی وجہ سے پسندیدہ ہے - اس لیے محبوب کے سراپے کی جو معمولی سی جھلک کلام غالب میں ملتی ہے اس میں تاریکی اپنا رنگ جمائے ہوئے ہے :

چشم خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سرمہ تو کہوے کہ دود شعلۂ آواز ہے
خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے
نگاہ دل سے ترے سرمہ سا نکلتی ہے

غالب ، تصور محبوب روائت سے نہیں اپنی خارجی زندگی اور داخلی نفسی کوائف سے حاصل کرتے ہیں - اس سے ان کی انا کو صحت مند راستہ مل گیا -

غالب روائتی تصورات حسن و عشق کا مخالف ہے۔ وہ عشقیہ تصورات کو بھی اس وقت تک قبول نہیں کرتا جب تک ذاتی تجربے کی مدد سے اس کے حسن و قبح کا جائزہ نہیں لے لیتا۔ وہ بنے بنائے شعری تصورات کا مخالف ہے۔ غالب کی قوت مقاوست کا میدان وسیع ہے:

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے طوفاں لیکن
ہم کو منظور تنک ظرفیٔ منصور نہیں

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

شنیدہام کہ بہ آتش نسوخت ابراهیم
بہ بیں کہ بے شرر و شعلہ می توانم سوخت

تماشائے گلشن، تمنائے چیدن
بہار آفرینا گنہگار ہیں ہم؟

حیف کہ من بخون تپم وز تو سخن رود کہ تو
اشک بدیدہ بشمری آہ بہ سینہ بنگری

دیتے ہیں جنت حیات دہر کے بدلے
نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے

ماحول سے مسلسل برسر پیکار رہ کر غالب نے اپنی "انا" کو یوں مستحکم کر لیا کہ آرزوؤں اور امنگوں کی سطح گرد و پیش

کی میسر شدہ آسائشوں سے بہت بلند اور ارفع ہو گئی :

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاش کے مکاں اپنا

نہ بندھے تشنگیٔ شوق کے مضموں غالب
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

مری ہستی فضائے حسرت آباد تمنا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حباب موجۂ رفتار ہے نقش قدم میرا

نا کردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

دمید دانہ و بالید و آشیاں گاہ شد
در انتظار ہما دام چیدنم بنگر

کوکبم را در عدم اوج قبولے بودہ است
شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

بیا و جوش تمنائے دیدنم بنگر
چو اشک از سر مژگاں چکیدنم بنگر

اپنے ماحول سے آمادۂ جنگ رہنے کی وجہ سے غالب کی زندگی مسلسل کشمکش، مسلسل اضطراب اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں سر گرداں رہی - اس سے ان کی ایغو (Ego) کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کی آب‌یاری ہوتی رہی - کچھ رجحان سقیم ہیں اور کچھ صحت مند[۴] -

(۳)

غالب ۱۸۲۶ء میں کلکتے گئے - ان کی ابتدائی دھلوی زندگی معاشی آسودگی میں بسر ہوئی تھی - جاگیرداری نظام کی مہیا کردہ آسائشیں اور لہو و لعب کے وہ سارے حیلے جو جسمانی اور ذہنی تسکین کے لیے فرد کو اس کے معاشرے سے ہم کنار کرنے کا باعث ہو سکتے ہیں غالب کو بھی میسر تھے - عیش و عشرت میں جوانی کو بسر کر کے غالب نے اپنے لیے امارت اور فارغ البالی کا جو نمونہ تراش لیا تھا وہ انھیں عمر بھر ایک آسیب کی طرح پریشان کرتا رہا - نواب احمد بخش خاں کی گوشہ نشینی (۱۸۲۶) اور خانگی معاملات کی پیچیدگی نے غالب کو زندگی کی جد و جہد کے دوراہے پر لا کھڑا کیا - ان میں بزور اپنا حق طلب کرنے کا احساس بیدار ہوا اور اس فعال قوت نے ان کے ہاں ذہنی اور عملی دونوں لحاظ سے ایک طوفانی سرگرمی کا آغاز کر دیا - وہ قانونی چارہ جوئی کے لیے کلکتے روانہ ہوئے - اس سے قبل وہ جذباتی آشوب سے دوچار ہو چکے تھے - ایسے میں کلام میں بے چارگی ، بے بسی خود رحمی اور غم کی فضا جھلکنے لگی تھی - ۱۸۲۶ء کے گرد و پیش کی غزلوں میں حالات کے سامنے اپنی بے بسی اور بے چارگی کا اعتراف اور ناکامیوں پر آنسو بہانے کا طریق زیادہ جاذب ہے :

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے
داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

غم کی تلخی کو اس انداز میں قبولنے کے لمحات بھی غالب پر اپنا اثر چھوڑ گئے- وہ پنشن کے مقدمے میں ناکام ہوئے اور انہیں قرض کے ایک مقدمے میں خانہ نشینی پر مجبور ہونا پڑا - اسی طرح کا شدید دور آخری عمر میں بھی آیا تھا جب انہیں ۱۸۵۷ء کے بعد طرح طرح کے مالی مصائب کا سامنا کرنا پڑا - قاطع برہان کے قضیے میں الجھنا پڑا اور قرض داروں کے ہاتھوں سخت عذاب کا سامنا ہوا -

ان تین ادوار میں غالب کی شخصیت انہیں بے بسی اور بے چارگی کے حصار میں مقید کر دیتی ہے اور وہ اپنے کلام میں گریہ و شیون کا سا انداز اختیار کرتے ہیں لیکن عام طور پر ان کی ' انا ' انہیں مثبت انداز میں مقاومت کا حوصلہ بخشتی ہے - اپنی ذات سے اس طرح کی نفرت کا احساس صرف وقتی ہے :

اور میں وہ ہوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں
غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے
سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے
جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے

ایسے میں بعض اوقات غالب اپنے غم کو دوسرے کا غم قرار

دے کر تسکین کا موقع ڈھونڈتے ہیں :

شورش باطن سے یاں تک مجھ کو غفلت ہے کہ وہ
شیونِ دل یک سرودِ خانۂ همسایہ ہے

لیکن بالعموم غالب کی قوت مدافعت حالات سے ٹکرانے اور بر پیکار ہونے ہی میں مسرت محسوس کرتی ہے - وہ عموماً زندگی سے مفاہمت کی بجائے مقابلے کی خواهش رکھتے ہیں - عمل ، حرکت اور حرارت انہیں زندگی کا حاصل معلوم ہوتی ہے - وہ حیات میں حرکت و تموج کے خواهاں ہیں :

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکے تو پھر لہو کیا ہے

گرد باد رہ بے تابی ہوں
صرصر شوق ہے بانی میری

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اس در پہ نہیں بار تو کعبے ہی کو ہو آئے

یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے ۔ کیا غالب کی " انا " مجموعی اعتبار سے انہیں حزن و یاس کے سمندر میں غرق کر دیتی ہے یا وہ زندگی کی ہر مثبت قدر کی نفی کرتے ہوئے زندگی کے بارے میں ایک معاندانہ رویہ رکھتے ہیں؟ غالب کی زندگی سیدھے خط سے عبارت نہیں ' اس میں مد و جزر ہیں - غالب اپنے اردو اور فارسی اشعار میں عقلی سطح کو جذباتی سطح پر فوقیت دیتے ہیں اس لیے ان کے ہاں زندگی کو تعقل کی مدد سے سمجھنے کا شعور پایا جاتا ہے - یہ ہوش مندی غالب کو مایوسی کی اتھاہ گہرائی میں گم نہیں ہونے دیتی - وہ زندگی اور اس کے مسائل کو ایک باشعور شخص کی طرح دیکھتے ہیں اس

سے ان کے تجربات میں گہرائی اور ان کے نقطۂ نظر میں ہوش و خرد کا رنگ زیادہ ظاہر ہوتا ہے ۔ لیکن میری دانست میں عقل کی یہ کار گزاری کسی ٹھوس فلسفیانہ نقطۂ نظر کا نتیجہ نہیں ۔ غالب بنیادی طور پر جذباتی شخص ہیں ۔ ان کی عقلی سطح در اصل ان کی زندگی کی جذباتی افتاد ہی کی ایک منقلب صورت ہے ۔ میرا قیاس یہ ہے کہ غالبؔ زندگی کو جذبات کے راستے سے دیکھتے ہیں اور اس کی فلسفیانہ تعبیر اور تشریح بعد میں کرتے ہیں ۔ اس لیے ان کے ہاں جذبات کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ عقلی فیصلے بھی مختلف ادوار میں مختلف طرح بیان ہوئے ہیں ۔ آپ اسے ان کے فکر کا تضاد کہیے یا ان کی متحرک زندگی کا سیماب یا لاوا ، وہ کسی منطقی فیصلے کو زندگی کا آخری فیصلہ نہیں جانتے ۔ جب حالات کے دباؤ سے ان کی انا کو صدمہ پہنچتا ہے تو وہ بھی زندگی کو آنی و فانی ماننے لگتے ہیں اور اپنے غم کو کبھی غفلت کے رویے سے ، کبھی فرار سے کبھی ، تسلیم و رضا سے ، کبھی نفرت و حقارت یا طنز و ظرافت سے ، قاری پر چھا جاتے ہیں ۔ وہ در اصل کیفیات (Moods) کے شاعر ہیں ۔ ان کی جذباتی زندگی جوانی کی ابتدائی منزلوں میں جذبات کی تہذیب کی طرف متوجہ ہوئی اور ان کے ابتدائی بے دلانہ کلام میں زندگی کو قبول کر کے اس سے کام لینے کا جذبہ قوی نظر آتا ہے لیکن یہ حالت پھر تغیر سے دو چار ہو گئی ۔ اپنی جوانی کے ایک حصے میں انہیں حالات سے مقابلہ بھی کرنا پڑا ۔ اب " انا " کو صدمہ پہنچا ۔ اس زمانے کی غزلوں میں غم کی گرفت زیادہ مضبوط ہے ۔ یہ دور ان کی مالی حالت کی ابتری کے علاوہ ان کی جذباتی ابتری کا دور بھی ہے ۔ کچھ مدت کے لیے " انا " غیر صحت مند راستے پر ذرا دور تک چل نکلی ۔ اب انہیں دلی کا ہر باشندہ دشمن نظر آنے لگا ۔ کلکتے سے واپسی کے بعد ۱۸۳۵ء تک ان کی انا مریضانہ راستوں پر

پارہ پارہ رہی :

" در عرض این سہ سال رسم و راہ اعیان دھلی برگشتہ و نام مہر و وفا در نہاد یاران نماندہ ــ گران مایگان و صاحب دلان در زوایائے خمول خزیدہ و سفلگان و سفیہان رونق عرصۂ دار و گیر گردیدہ "۵

"چہ گویم از بخت خود چقدر گلہ مندم و از ہجوم اندوہ چہ مایہ نژندم - خلقے سر آزار من دارد و عالمے تشنۂ خون من است ـ"۶

" حقا کہ مہر و آزرم در نہاد مردم دھلی نیست"۷

"دہلویان حسد پیشہ چون مرا مخلص صادق الولائے مولوی دانستند رنگ آن ریختند کہ در ہر روزے دو بار سہ بار پراگندہ گوئے نزد من آید و آنچہ خواہد از پیش خود بتراشد و بیان نماید"۸

" منت خدائے را کہ نامرادی و نا کامی بر من آسان است اما برخے از خندۂ عوام و ملامت خواص آزار می کشم ـ "۹

"ملول بودن از کلکتہ چہ غضب است - واللہ کہ دھلی شائستگی آن ندارد کہ آزادۂ در وے خاک‌نشین تواند بود ـ خاص و عام این بقعہ بے سبب آزار و مرد و زن این تیرہ بوم مردم خوار ، بخاطر دارد کہ چون این داوری بپایان رسد بہ بہانۂ ازیں شہر بر آیم و کلکتہ را در یابم" ۱۰ ـ

"تا کجا شکیب ورزم و خود را بہیچ شادمان دارم از در و دیوار شاھجہان آباد بلا می بارد"۱۱ـ

یہ خط ۱۸۲۹ء سے لے کر ۱۸۳۵ء کے درمیان مختلف اوقات میں لکھے گئے ۔ اس دور میں پنشن کے مقدمے کا فیصلہ غالب کے خلاف ہوا ، قرض کے مقدمے میں گوشہ نشین ہوئے ، ولیم فریزر کا قتل ہوا اور غالب ایک محسن سے محروم ہو گئے ۔ غالب کے حالات میں سارے دلی والے ملوث نہ تھے ۔ ان کی نرگسیت مریضانہ راستے پر مصروف سفر ہو چلی تھی لیکن انا نے انہیں پھر سعی و کوشش کے راستے پر ڈال دیا اور ۱۸۵۷ء تک وہ اس مریضانہ صورت حال سے بچ گئے ۔ یہی زمانہ ان کی فارسی شاعری اور نثر نویسی کے عروج کا ہے ۔ اس دور میں غالب نے فارسی شاعری پر زیادہ توجہ کی اور یہ کلام ان کی شخصیت کو زیادہ مربوط اور ان کی جذباتی زندگی کو زیادہ استوار کر کے پیش کرتا ہے ۔ غالب پھر صحت مندی سے روشناس ہو گئے ۔ اس مستحکم اور پر وقار جذباتی زندگی میں آخری طوفان ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے پیدا کیا ۔

غالب کی نجی زندگی بھی کچھ زیادہ کامیاب معلوم نہیں ہوتی ۔ بے اولادی کا احساس انہیں شدت سے رہا اور آخر عمر میں اس کا احساس زیادہ شدید ہو گیا تھا ۔ کلکتے سے واپسی تک وہ اولاد کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے ۔ اپنی انا کے استحکام سے وہ ان ذاتی محرومیوں کا مقابلہ طنزیہ و مزاحیہ پیرائے سے کرتے رہے ۔ ان کی شوخی اور شوخ بیانی شعری سرمائے کا نادر حصہ ہے ۔ آرزو کی شدت ، جد و جہد کی کثرت ، مقاصد کی کی بلند آہنگی ، غالب ان وسائل سے اپنی توانائی کو بحال کیے ہوئے تھے :

حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز
دعا قبول ہو یا رب کہ عمر خضر دراز

۱۸۵۷ء میں ان پر گزرنے والے صدمات نے انا کو ایک بار پھر سقیم راستوں پر ڈال دیا ۔ برہان قاطع کے سلسلے میں غالب کی جوابی کاروائیاں صحت مند انسان کے مزاج کو پیش نہیں کرتیں ۔ اعصاب کی کمزوری کے ساتھ شخصیت کا تارو پود بھی بکھرنا شروع ہو گیا ۔ اس زمانے میں قرض‌خواہوں کے ہاتھوں بھی غالب پریشانی میں گرفتار رہے ۔ قربان علی بیگ سالک کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

"یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں، مخلوق کا کیا ذکر ؟ کچھ بن نہیں آتی ۔ آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں ۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں ' یعنی میں نے اپنے کو غیر تصور کیا ہے ۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں لو غالب کے ایک اور جوتی لگی ۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں ۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں ۔ لے اب قرض داروں کو جواب دے ۔ سچ تو یوں ہے غالب کیا مرا بڑا ملحد مرا ، بڑا کافر مرا ۔ ہم نے از راہ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے "جنت آرامگاہ" "عرش نشین" خطاب دیتے ہیں ، چونکہ یہ اپنے آپ کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا ، "سقر مقر" اور "ہاویہ زاویہ" خطاب تجویز کر رکھا ہے ۔ آئیے نجم الدولہ بہادر ایک قرض‌دار کا گریبان میں ہاتھ ، ایک قرض‌دار بھوگ سنا رہا ہے ۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں ۔ اجی حضرت نواب صاحب ۔ نواب صاحب کیسے ، اوغلان صاحب ۔ آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں ۔ یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے ؟ کچھ تو اکسو ، کچھ تو بولو ۔ بولے کیا بے حیا ، بے غیرت ، کوٹھی سے شراب ، گندھی سے گلاب ، بزاز سے کپڑا ، میوہ فروش سے آم ، صراف سے دام قرض لیے جاتا تھا ۔ یہ بھی سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا[۱۴]" ۔

یہ لب و لہجہ اپنی شخصیت کی شکست ریخت کے عمل کو

اپنی آنکھوں سے دیکھ کر پیدا ہوا ہے -

غالب کی شخصیت ٹیڑھی لکیر ہے جس میں جذباتی مد و جذر نے رنگا رنگی اور تنوع پیدا کر رکھا ہے - اس کے پیچھے کسی مستقل اور مرتب نظام فکر کی جستجو ممکن نہیں - وہ شاعر پہلے ہیں فلسفی یا کچھ اور بعد کو ہیں -

(۵)

لارڈ لیک کے قبضہ دھلی ۱۸۰۳ء سے پہلے غالب پیدا ہوئے تھے - انہوں نے شاہ عالم ثانی ، اکبر شاہ ثانی اور ابو ظفر بہادر شاہ کا دور دیکھا -

وہ جس معاشرے کے فرد تھے اس میں پرانا تہذیبی ڈھانچہ ختم ہو رہا تھا - اقدار کی شکست کا عمل شروع ہو چکا تھا - نئے معاشرے نے پرانے معاشرے کی جگہ ابھی نہیں لی تھی - نئی اقدار جن کا چلن ۱۸۵۷ء کے بعد ہوا ابھی محض سایہ ریز تھیں - ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی پالیسی نے متوسط طبقے کے وجود میں آنے کے فطری عمل کو روک رکھا تھا - شہری زندگی اور صنعتی کاروبار کو ختم کر کے پاک و ہند کو زرعی معیشت کی طرف لے جانے کی شعوری کوششوں کا نتیجہ یہ تھا کہ سیاسی اور اقتصادی نظام کے ساتھ ساتھ تہذیبی عمارت کا شیرازہ بھی بکھرتا چلا گیا - قدیم نظام معیشت کے خاتمے کے ساتھ قدیم اقدار پر زد پڑی - روحانی تقاضوں کی جگہ ابھی مادی مقتضیات نے نہیں لی تھی ، خلا کی کیفیت تھی - نئے علوم اور نئے سائنسی انکشافات کو معاشرتی زندگی میں کسی حد تک محسوس کیا جا رہا تھا ، لیکن زندگی اور نظریات زندگی کے درمیان فاصلے بڑھ چکے تھے ، عقیدے اور عمل میں تباین کی حالت تھی - اقدار کی مثالی صورتیں صرف ذہنوں میں تھیں عملی زندگی ان سے محروم ہو چکی تھی - مختلف عوامل کا یہ تصادم

غالب کے سامنے تھا ۔ حساس اور باشعور انسان کی طرح انہوں نے اسے دیکھا ۔ زندگی کے تضاد نے ان کی شوخی اور شوخ بیانی کے لیے مواد فراہم کیا ۔ کبھی کبھی وہ اس تضاد کو بہت نمایاں شکل میں بھی دیکھتے ہیں :

فرصت اگرت وقت دید مغتنم انگار
ساقی و مغنی و شرابے و سرودے
زنہار ازاں قوم نہ باشی کہ فریبند
حق را بسجودے و نبی را بہ درودے

بے عملی اور جمود کی جگہ غالب کی شاعری حرکت اور عمل کی نقیب ہے ۔

نئی زندگی کے تقاضے اور اس کی خارجی شکل ابھی پوری طرح سامنے نہیں آئی تھی ۔ غالب کے ہاں زندگی کی مثبت قدروں کا احساس خفی ہے ، ان کی معین صورتیں نہیں ہیں ۔ یہ صورتیں آگے چل کر سرسید احمد خاں اور حالی کی تحریروں میں پہلی بار نکھر کر سامنے آتی ہیں ۔ جب شعر و ادب کا تعلق زندگی کے گہرے شعور کے ساتھ استوار ہو گیا ۔ غالب کے زمانے تک یہ منزل نہیں آئی تھی ۔ غالب کا رویہ انفعالی رجحانات کے خلاف ایک احتجاج تو ہے بغاوت نہیں ۔ اس کی شعری فضا وہی معاشرتی زندگی ہے جو ذوق اور شاہ نصیر کی کی زندگی تھی ۔ بس اتنا ہے کہ غالب نے منفی رجحانات کی تائید سے اپنی شاعری کا چمن نہیں سجایا ۔ اس نے ذاتی تجربے کی اہمیت کو شدت سے محسوس کیا اور اپنے عقیدے پر عمل پیرا ہو کر اردو ادب کو زندہ اور پائیدار طرز احساس عطا کیا ۔ یہ طرز احساس آج بھی اردو شاعری کے لیے سرمایۂ افتخار ہے ۔

حواشی

(۱) اردوے معلیٰ، غالب نمبر، فروری ۱۹۶۰ء حصہ اول صفحہ ۴۷ تا ۵۶ (مقالہ بعنوان ''غالب اور مغل شاہان دہلی کا تاریخی نظریہ'' از ڈاکٹر محمد اشرف)۔

(۲) نفسیاتی طور پر تاریکی رحم مادر کی علامت بھی ہے۔ قفس اور کنج قفس کے تلازمات بھی غالب کے ہاں زندگی اور زندگی کے اس تعلق کا اشارہ ہیں:

فشار تنگی خلوت سے بنتی ہے شبنم
صبا جو غنچے کے پردے میں جا نکلتی ہے
بیضہ آسا ننگ بال و پر ہے ہر کنج قفس
از سر نو زندگی ہو گر رہا ہو جائیے

اس تاریکی کا رشتہ غالب کی نفسیاتی چسپیدگی (Fixation) سے بھی ہے۔ کیا غالب کے ہاں یہ علامت محبوب کی زلف سے غیر معمولی دلچسپی کا نتیجہ ہے؟ یا خون ہی کی ایک حالت متغیرہ سے لگاؤ کا نتیجہ ہے؟ یا محبوب کی سیاہ رنگت سے؟ اس کے بارے میں قطعیت سے اس وقت تک کچھ کہنا ممکن نہیں جب تک غالب کی زندگی کے بارے میں کچھ مزید معلومات حاصل نہ ہو جائیں۔ رحم مادر، خون، تاریکی کا باہمی تعلق جس صورت حال کی طرف اشارہ کرتا ہے ہمارے مقالے میں اسی کو ممکنہ صورت حال قرار دیا گیا ہے۔

(۳) تفصیل کے لیے دیکھیے نقد غالب، مقالہ بعنوان ''غالب کا تصور حسن و عشق''، حمید احمد خاں ص ۷۶ تا ۱۱۸۔

(۴) اس نکتے کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ابن فرید کا مقالہ بعنوان ''غالب اور تسکین ضمیر'' در صحیفہ، غالب نمبر حصہ دوم۔

(۵) مکتوب بنام مولوی سراج الدین، تاریخ تحریر ۲۸ نومبر ۱۸۲۹ء متفرقات غالب، ص ۲۔

(٦) مکتوب بنام مولوی سراج الدین ، متفرقات غالب ، ص ۳۵ -

(۷) ایضاً ص ۵۰ -

(۸) ایضاً ص ۵۴ -

(۹) مکتوب بنام مرزا احمد بیگ خاں ، ایضاً ص ٦۲ -

(۱۰) مکتوب بنام مرزا احمد بیگ خاں ، ایضاً ص ٦٦ -

(۱۱) مکتوب بنام مرزا علی بخش ، کلیات نثرِ غالب ، ص ۳۳ -

(۱۲) محاسن خطوط غالب ، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ، ص ۱۱۰ -

غالب کا ایک شعر

نشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مست طرب

شیشۂ مے سرو سبز جوئبار نغمہ ہے

شارحین غالب نے جو کچھ کہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ رنگ سے مراد رنگ محفل ہے، نغمے کو جوئبار سے تشبیہہ دی گئی ہے اور روانی وجہ شبہ ہے۔ شیشۂ مے کو سرو سبز سے بہ اعتبار سبزی تشبیہہ دی گئی ہے۔ شعر کی ان خارجی خصوصیات کے علاوہ اس میں ایک خاص فضا بھی دکھائی دیتی ہے جس کا احساس خفی ہمارے شارحین رکھتے تھے۔ آغا باقر کے خیال میں شعر کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ مصنف نے بہار اور نغمہ اور شراب کی کیفیت دکھائی ہے[1]۔ بیخود اس کیفیت کا زیادہ واضح سراغ نہیں لگا سکے۔ ان کی رائے میں شراب نے نغمے میں اور نغمے نے شراب میں اس درجہ سرایت کر لی ہے کہ مینائے شراب سرو جوئبار نغمہ بن گیا ہے[2]۔ قاضی سعیدالدین کے خیال میں شعر کا مرکزی تاثر یہ ہے کہ محفل معشوق میں ایسا سرور ہے کہ خود نشے اس کے رنگ میں شاداب ہیں[3]۔ مولانا آسی کی رائے میں اس شعر کی مرکزی حیثیت بہار سے متعین ہوتی ہے اور مصنف نے بہار کا سماں دکھایا ہے[4]۔

مرکزی تاثر تک پہنچنے کے لیے ہمیں تشبیہوں کی ظاہری شکل و صورت سے گزر کر اس کے موڈ کو سمجھنے کی کوشش کرنی پڑے گی۔ شعر کی ساخت تشبیہات کے دو تین متوازی سلسلوں کی

مرہون منت ہے۔ نشہ شاداب رنگ ہے، ساز مست طرب ہے، نغمے کی ندی بہہ رہی ہے اور شیشۂ مے اس ندی کے کنارے ایک سرو سبز ہے۔ پہلے مصرعے میں شاعر نے نشے کو "شاداب رنگ" قرار دے دیا ہے اور قوت باصرہ کا عمل دکھایا ہے۔ نشے کا نتیجہ یہ ہے کہ ساز بھی مست طرب معلوم ہوتے ہیں، Visual Image موجود ہے۔ دوسرے مصرعے میں پہلے مصرعے کی تصویر کو مکمل کیا ہے اور اس مقصد کے لیے لمبی تشبیہہ کا سہارا لیا ہے۔ نغمے کی ندی بہہ رہی ہے اس کے کنارے شراب کی صراحی سبز سرو کی حیثیت سے موجود ہے، گویا شعر کا بنیادی نقطہ شراب کا نشہ ہے۔ اسی کے زیر اثر شاعر بہار، نغمے اور ندی کو دیکھتا ہے۔ یہ جو بعض نے کہا ہے کہ شعر میں بہار کا سماں دکھایا گیا ہے درست معلوم نہیں ہوتا۔ یہاں نشے کی کیفیت کو بہار کے پیکر میں مجسم کیا گیا ہے۔

غالب کے ہاں شراب نوشی کے کئی مقصد ہیں۔ بعض اوقات غم غلط کرنے کے لیے شراب پیتے ہیں، لیکن زیادہ تر ان کی شراب سے غرض نشاط ہی ہے اور کلام غالب میں ایسے اشعار کی کمی نہیں۔ اس شعر میں ذکر سے کے علاوہ غالب کی کئی محبوب ترکیبیں بھی پائی جاتی ہیں۔ غالب نشے کا لفظ بہت پسند کرتے ہیں۔ ان کے اردو اور فارسی کلام میں یہ لفظ بار بار آیا ہے۔ نشہ ان کے ہاں فکر سخن سے بھی وابستہ ہے:

تازہ نہیں ہے نشۂ فکر سخن ہنوز
تریا کی قدیم ہوں دود چراغ کا

نشہ ان کے ہاں جنت کے روائتی تصور سے اثر پذیری کا نتیجہ

بھی ہے:

دیتے ہیں جنت حیات دہر کے بدلے

نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے

نشے کی تیسری صورت جو اس شعر میں زیادہ نمایاں ہے وہ رنگ سے نشے کا تعلق ہے۔ غالب نشے اور رنگ کو یک جا دیکھ رہے ہیں:

نشہ ہا شاداب رنگ.............

نشۂ رنگ کی ترکیب ایک اور جگہ غالب نے یوں پیش کی ہے:

نشۂ رنگ سے ہے واشد گل

مست کب بند قبا باندھتے ہیں

شارحین ''نشہ ہا شاداب رنگ'' سے مراد ''نشہ ہائے رنگ محفل'' لیتے ہیں۔ اس کا قرینہ سمجھ میں نہیں آتا۔

رنگوں میں غالب کو دو رنگ زیادہ عزیز ہیں، سرخ اور سبز۔ سبز انہیں زیادہ لبھاتا ہے۔ مینا اور شیشہ کو وہ اکثر سبز قرار دیتے ہیں:

سبز ہے جام زمرد کی طرح داغ پلنگ

تازہ ہے ریشۂ فارغ صفت روئے شرار

مستیٔ باد صبا سے ہے بعرض سبزہ

ریزۂ شیشۂ مے، جوہر تیغ کہسار

مینائے مے ہے سرو نشاط بہار مے

بال تذرو جلوۂ موج شراب ہے

مینا کی سبزی کے علاوہ سرو کی سبزی، طوطی کی سبزی اور سبزہ‌زار کی تازگی غالب کو بہت لبھاتی ہے ۔ غالب نشے کی حالت میں بھی ان محبوب تصورات کو ترک نہیں کرتے ۔ نشے کے صحیح ادراک کے لیے ہمیں غالب کے مندرجہ ذیل تین شعر پیش نظر رکھنے چاہئیں :

(۱) نشہٗ رنگ سے ہے واشد گل
مست کب بند قبا باندھتے ہیں

(۲) مینائے مے ہے سرو نشاط بہار سے
بال تذرو جلوۂ موج شراب ہے

(۳) ہیں بسکہ جوش بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

مست طرب، شاداب رنگ وغیرہ اکبری دور کی یاد دلاتی ہیں ۔ خصوصاً ظہوری کی، لیکن Images کا پیچ در پیچ سلسلہ غالب کا اپنا ہے ۔ شیشہ مے کو "سرو سبز" قرار دیا ہے ۔ شیشے کی یہ سبزی شراب کا رنگ ہو سکتی ہے اور خود شیشے کا رنگ بھی ۔ "نشہ ہا" ساز ہا کی طرح نشے کی کثرت بھی ظاہر کرتی ہے اور نشے کے مختلف مدارج کا بیان بھی اسے سمجھا جا سکتا ہے ۔ "نشہ ہا" سے مراد نشۂ فکر سمجھنا بھی ممکن ہے اور نشۂ شراب اور نشۂ عشق بھی ۔ اس صورت میں شعر کے معنی بدل جائیں گے، اور توضیح و تشریح کا سلسلہ بہت دور نکل جائے گا ۔ اسے آپ شعر کا ابہام کہہ سکتے ہیں، لیکن یہ ابہام شعر کے مرکزی تاثر کو نقصان نہیں پہنچاتا بلکہ اس سے شعر کی کئی گہری معنویتیں اجاگر ہوتی ہیں ۔

حواشی

۱ - بیان غالب ، ص ۴۷۷ -
۲ - مراۃ الغالب ، ص ۲۷۱ -
۳ - ہدیۂ سعیدیہ ، ص ۳۷۶ -
۴ - مکمل شرح دیوان غالب ، ص ۲۷۶ -

غالب کا ایک اور شعر

نقش فریادی ہے کسی کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

اس شعر میں شارحین نے خاصے اختلاف کا ثبوت دیا ہے۔ نظم طباطبائی سے لے کر دور حاضر کے شارحین تک توضیحات و تشریحات کا لمبا چوڑا سلسلہ ہے۔ غالب نے جو وضاحت کی ہے وہ شعر کے مطالب کی مختلف تہوں سے متعلق نہیں، بلکہ محض کاغذی پیرہن کی ترکیب سے متعلق ہے۔ ایران کی ایک رسم قدیم کا یہ حوالہ کہ دربار میں داد خواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا تھا اور یہ صورت فریاد اور دادخواہی کی تھی، شعر کی توضیح کرنے سے قاصر ہے۔ "کاغذی پیر ہن" سے مراد کسی چیز کے عارضی اور اعتباری ہونے سے ہے۔ در اصل شعر کے معنی اور مطالب ایک پورے سلسلۂ خیال سے متعلق ہیں۔ نقش، پیکر، تصویر، کاغذی پیر ہن اور شوخیٔ تحریر، ان سب کا تعلق ایک خاص طرح کے علمی اور ثقافتی ورثے کے ساتھ ہے۔

شعراء کے یہاں ہمیں یہ التزام ملتا ہے کہ اپنے دیوان کی ترتیب کے وقت اس کا آغاز حمد کی غزل سے کرتے تھے اور اس کے بعد نعت سے متعلق غزل کا اندراج ہوا کرتا تھا۔ بعض شعراء نے اس میں اتنی تبدیلی کی ہے کہ پہلی غزل ہی میں یا اس کے شروع کے ایک دو شعروں میں اس التزام کو کافی سمجھا۔ بارہویں بلکہ

تیرہویں صدی ہجری تک عموماً غزل گو شعراء کے دواوین میں اس طریق کار کے نشان ملتے ہیں۔ غالب کا دیوان بھی اس روایت سے الگ معلوم نہیں ہوتا؛ اس لیے کہ ''نقش'' اور ''مصور'' کی اصطلاحیں محض مصوری سے متعلق نہیں ہیں، اپنی تعبیر کے اعتبار سے ان کا سلسلہ تصوف کے ساتھ بھی ہے۔ صوفیاء کے یہاں واردات اور عقائد دونوں کے بیان میں مجازی زبان کا استعمال ہوا کرتا ہے۔ ''نقش'' اور ''مصور'' اپنے ظاہری مطالب کے علاوہ ایک داخلی توسیع بھی رکھتے ہیں۔ غالب جس معاشرتی اور علمی فضا میں رہتے تھے اس میں بعض مخصوص الفاظ کا استعمال اور ان کے مطالب کے مختلف پہلوؤں کا ابلاغ معاشرتی زندگی کے بعض دوسرے دائروں سے منسلک ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تصوف کا عملی رخ غالب کے زمانے تک خاصہ سرد پڑ چکا تھا لیکن یہی وہ سماجی فضا ہے جس میں عمل اور عقیدے میں تضاد پیدا ہو چکا تھا؛ تاہم جذباتی سطح پر اب بھی اس کے کم و بیش حوالے شعراء کے کلام میں ملتے ہیں۔ غالب کا '' نقش فریادی'' اپنے مفہوم میں نقاشی اور تصوف دونوں سے رشتہ جوڑتا نظر آتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ غالب صوفی تھے یا عابد شب زندہ دار تھے یا نقاش اور مصور تھے، بلکہ کہنے کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ غالب جس فکری اور جذباتی فضا میں رہتے تھے اس کی کڑیاں بہت دور پیچھے تک مذہبی اور ثقافتی روایات سے منسلک ہیں۔

نقش کا لفظ ادبیات فارسی میں مختلف معانی و مطالب کے لیے مستعمل ہے[۱]۔ نقش سے مراد صورت، ہیبت و تمکین، نقش نغمہ، نقش بیش، نقش زیاد، نقش دیوار، نقش باز، نقش ساز، نقش پرداز، نقش طراز، نقش گر، نقش خرام، نقش نشستن، نقش افتادن، نقش داشتن، نقش بر گرفتن، نقش ریختن، نقش شکستن، نقش بیجا، نقش جہاں، نقش برآب کشیدن، یہ سارے الفاظ بظاہر نقش کی کرامت ہیں لیکن

اپنے مفاہیم و مطالب کے لیے تہذیبی زندگی کے مختلف خط و خال سے تعلق رکھتے ہیں اور جذبات و کیفیات کی متنوع صورتوں کو پیش کرتے ہیں ۔ حیرانی و سراسیمگی ، خوف و ہراس ، اعتبار اور ساکھ ، بے حاصلی اور بے ثباتی ، تخلیق اور استقرار، حوصلہ افزائی اور تدبیر، فتح و کامرانی ، موقع اور محل کی نسبت سے کامیابی ، عام زندگی کے یہ مختلف پہلو مذکورہ بالا تراکیب میں بخوبی جھلکتے ہیں جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نقش کا لفظ مفاہیم و مطالب کے لیے زندگی کے کتنے وسیع پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہے ۔ مجازی استعمال کی ان روزمرہ صورتوں سے ہٹ کر تخیلی صورتوں کو دیکھیں تو نقش اور نقاش ، مصور اور مصوری کے لیے مستعمل ہے ۔ "نقش گر" سے مراد نقش بند اور مصور ہے ۔ زندگی کے تزئینی اور آرائشی پہلوؤں کا یہ استعارہ تخلیق سے متعلق بھی ہے : "نقش افتادن" سے مراد کسی نقش کی تخلیق ، کسی چیز کی شبیہہ بنانا ، استعداد و صلاحیت کو اُبھارنا ، "نقش ریختن" سے مراد کسی چیز کو پیدا کرنا ، عدم سے کسی چیز کو وجود میں لانا ۔

مطالب کا یہ سلسلہ اپنی اصطلاحی صورت میں کائنات کی تخلیقی صورتوں کا استعارہ بھی ہے ۔ خدا نے کائنات کو تخلیق کیا ۔ وہ خالق ہے ، اس نے کن کہا دنیا وجود میں آ گئی ، یعنی فیکون ۔ کائنات کا یہ تخلیقی عمل چھوٹے پیمانے پر مصور کے تخلیقی عمل سے مشابہت رکھتا ہے ؟ اس لحاظ سے خدا مصور یا نقاش اور انسان اس کی تخلیق ہے ۔ کائنات بھی اس کی تخلیق ہے ۔ اسی لیے دنیا کو نقش فانی اور موجودات خارجیہ کو "صور کونیہ" ، کی اصطلاح میں صوفیاء نے پہچاننے کی کوشش کی ہے ۔

یہ اشکال و اجسام حقائق عینیہ کے اجسام ناسوتی ہیں ۔ دنیا خدا تعالیٰ کی نقش گری کا ایک نمونہ ہے ۔ انسان بھی اسی کی

تخلیق ہے۔ خدا خالق ہے، انسان مخلوق ہے، خدا مصور ہے انسان تصویر ہے، خدا نقاش ہے انسان نقش ہے۔ "نقش" کا لفظ تزئین و آرائش کی ایک صورت کو ظاہر کرتا ہے۔ انسان احسن التقویم ہے یعنی تخلیق کائنات میں سب سے زیادہ اہم چیز، لیکن دنیا آنی و فانی ہے۔ یہ نقش بھی حوادث زمانہ کے ہاتھوں اپنی عارضی زندگی ختم کر کے دنیاوی وجود کے خاتمے پر منتج ہوتا ہے۔ ایک طرف تو انسان خدا کی بہترین تخلیق، دنیا پر اس کا خلیفہ ہے، موجودات کا وجود اسی کے لیے ہے، لیکن دوسری طرف اس کی ہستی ناپائیداری کا لباس پہنے ہوئے ہے:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

انسانی زندگی کے یہ دو پہلو شاعر کی توجہ کا خصوصی مرکز ہیں:

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

لغت نویسوں کے نزدیک "کاغذی پیرہن" کی ترکیب فانی اور عارضی ہونے کا ثبوت ہے۔ نقاش کاغذ پر تصویر بناتا ہے۔ ہر پیکر تصویر کا پیراہن فی الحقیقت کاغذی ہے۔ مجازی طور پر اس کے فانی ہونے کا اشارہ خود نقش کی تخلیق میں چھپا ہوا ہے۔ ایک طرف تو انسان خدا کی تخلیقی قوتوں کا بہترین نقش ہے لیکن یہ نقش فریاد کر رہا ہے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا

یہ نقش خدا تعالیٰ کی شوخیٔ تحریر کا فریادی ہے۔ خالق ات نے انسان جیسی عظیم چیز کو تخلیق کیا لیکن یہ کیا ستم ہے

کہ اس کا وجود عارضی ہے - اب اگر "نقش" اپنے مصور سے فریاد نہ کرے تو کیا کرے - خدا تعالیٰ سے براہ راست تخاطب گستاخی ہے، اس لیے اشارہ و کنایہ سے بات کا ڈھنگ نکالا ہے کہ یہ نقش "کسی" کی شوخیٔ تحریر کا فریادی ہے - اسی مفہوم کو مولانا روم نے اپنی مثنوی میں دوسرے استعاروں کی مدد سے واضح کیا ہے - انہوں نے مصوری کی بجائے موسیقی کی اصطلاحات کا سہارا لیا ہے :

بشنو از نے چون حکایت می کند

وز جدائی ہا شکایت می کند[۲]

اس شعر میں وہی مرکزی خیال پیش نظر ہے - انسان کو تخلیق کیا گیا اور اب وہ خالق سے شکایت کر رہا ہے - مولانا روم کے نزدیک یہ شکایت اس وجہ سے ہے کہ یہ نغمہ اپنے اصل سے جدا ہو کر فضا میں تیر رہا ہے - اسے یہ شکایت ہے کہ میں اپنے اصل سے دور ہو گیا ہوں - وہ دوبارہ اپنے مرکز کی طرف جانے کے لیے گلہ گزاری پر آمادہ ہے - مولانا روم نے شکایت کے مفہوم کو زیادہ قطعی شکل دی ہے، غالب کی تعمیم زیادہ گہرے مطالب کی حامل ہے - یہ نقش محض مصور کا گلہ گزار نہیں اس کی شوخیٔ تحریر کا فریادی ہے - کیا اس شوخی کا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ جب خدا نے انسان کو تخلیق کیا تو فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا ؟ فرشتوں نے انسان کی تخلیق کا مقصد دریافت کیا تو جواب ملا کہ جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے - انسان کو اسم سکھائے گئے اور وہ خدا تعالیٰ کا خلیفہ اور احسن التقویم قرار پایا - اس عظمت کے ساتھ اس نقش کا یہ رخ کہ وہ عارضی و فانی ہے، اپنے اندر شوخی کے کئی پہلو رکھتا ہے - غالب نے محض جدائی کی شکایت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نقش کو کسی کی شوخیٔ تحریر کا فریادی

قرار دے کر ایک نیم متأشی، نیم طنزیہ رویہ اختیار کیا ہے۔ فکر و نظر کے اس سر چشمے کو اقبال نے انہیں استعاروں کی مدد سے یوں بیان کیا ہے :

مجھ کو پیدا کر کے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا
نقش ہوں اپنے مصور سے گلہ رکھتا ہوں میں

ان توضیحات کی روشنی میں اگر ہم غالب کے شعر پر غور کریں تو اس کی ایمائی حیثیت مختلف سمتوں میں ہماری راہنمائی کرتی ہے۔ انسان نقاش کی تصویر کی طرح حسین، جاذب، دل کش اور فنکار کے قلم کا بہترین نمونہ ہے، لیکن یہ نقش خود اپنے خالق کی شوخیٔ تحریر کا فریادی ہے :

ہر چند کہ رنگ و بوے زیبا ست مرا
چوں لالہ رخ و چو سرو بالا ست مرا
معلوم نشد کہ در طرب خانۂ خاک
نقاش ازل بہر چہ آراست مرا[۳۱]

نقاش کی شوخیٔ تحریر حسن نظر کی سیکڑوں صورتیں ایک ہی نقش میں ابھارتی ہے۔ مطالب اور مفاہیم کے مختلف پہلو فکر و نظر کی عجوبہ کاری، تخلیقی قوتوں کے اظہار کے متنوع طریقے، نقاش کے کمال فن کا ثبوت ہیں۔ لیکن یہ خالق یہ نقش تصویر کا نقشہ کاغذ پر بناتا ہے۔ کاغذی پیراہن روایتی لحاظ سے فریادی کا لباس ہے۔ کاغذی پیرہن کسی چیز کے عارضی اور فانی ہونے کی علامت بھی ہے؛ اس لحاظ سے نقاش کی شوخیٔ تحریر خود اپنے اندر فریاد کا ایک پہلو رکھتی ہے۔ غالب نقاش اور خدا کے درمیان مماثلت کے ایک سے زیادہ رشتے دریافت کرتا ہے اور ان کے بارے میں ایک خاص طرح کا شوخ لب و لہجہ بھی نکالتا ہے، جو اردو اور فارسی شاعری کے روایتی لہجے سے کسی قدر مختلف ہے۔

حواشی

۱ - ان الفاظ و تراکیب کے لیے ملاحظہ ہوں ، غیاث اللغات ، فرہنگ انندراج ، مصطلحات الشعراء -

۲ - یہ مثنوی مولوی کا پہلا شعر ہے -

۳ - یہ رباعی عمر خیام کی ہے -

غالب کا نظریۂ شعر

دراں دیار کہ گوہر خریدن آئیں نیست
دکان کشودہ‌ام و قیمت گہر گویم

ہم بوے نشاط از گل ذوق سخن انگیز
ہم گرد کساد از رخ جنس ہنر افشاں

زلہ بردارظہوری باش، غالب بحث چیست
در سخن درویشیٔ باید نہ دکان‌داریٔ

حالی نے شاعری کو دکانداری قرار دیا تھا ان کی شاعری اسی دکانداری کے بوجھ تلے مر گئی ۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ دو اور دو چار زندگی تو ہے ' لیکن دو اور دو چار کو شاعری بنانے کے لیے دکانداری کے سطحی تصور سے گزر کر کسی ایسے انداز نظر کی ضرورت ہے جو " دکانداری " پر " درویشی" کو ترجیح دے سکے ۔ یوں تو ماننے کی بات ہے کہ اپنی گرہ میں مال ہونا ضروری ہے ؛ لیکن ایک شاعر کو وقت کی حدود سے بالا ہو کر اپنے گرد و پیش بھی دیکھنا پڑتا ہے[1] ۔ اسی ترنگ میں اگر زلہ برداری بھی ہوجائے تو کیا برائی ہے ؛ لیکن شرط یہ ہے کہ زلہ‌برداری سرقہ یا توارد[2] نہ ہونے پائے :

نگویم تازہ دارم شیوۂ جادوبیاناں را
ولے درخویش بینم کارگر جادوے آناں را

کیونکہ بقول ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ روایت (Tradition) تو ماضی کو اپنی ہڈیوں میں رچا کر آگے بڑھنے کا نام ہے۔ اب یہ شاعر کا کمال ہے کہ قاری کے لیے (جو روایت کو سمجھے بغیر شاعر کو سمجھنا چاہے) ساز شعر کے خفیف ارتعاشات کا ادراک تقریباً نا ممکن کر دے:

غالب مذاق ما نتواں یافتن ز ما
رو شیوۂ نظیری و طرز حزیں شناس

غالب از اوراق ما نقش ظہوری دمید
سرمۂ حیرت کشیم' دیدہ بدیدن دہیم

بہ نظم ونثر مولانا ظہوری زندہ‌ام غالب
رگ جاں کردہ‌ام شیرازہ اوراق کتابش را

عیار فطرت پیشینیاں ز ما خیزد
صفائے بادہ ازیں درد تہ نشیں پیداست

ادبی تحریکوں کو "رگ جاں" بنانا "حسن ادا" کی پرداخت' ایک ایک جذبے کی خوش رنگی کا احساس' ایک ایک لفظ کی نبض‌شناسی یہ سب کچھ قید مکان و زماں سے بلند ہو کر ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ بیدل' صائب' حزیں' ظہوری' عرفی اور حافظ مختلف ادوار کے نمائندے ہیں' لیکن ایک مخصوص انداز نظر کو پیدا کرنے اور پھر اس کی روشنی میں شعری سرمائے کی جانچ میں غالب کے رفیق کار بھی ہیں۔ غالب کی شخصیت نے انہیں شعرا کے کلام کی روشنی میں اپنا راستہ بنایا۔

خراسانی روایات جب شیرازی بننے لگیں اور نظامی' انوری' ظہیر اور خیام کا طلسم ٹوٹ چکا' تو شیرازی فضا نے اس کی نوعیت

ہی کو بدل دیا ۔ غزل کو ایک رچا ہوا تغزل اور حرف و صوت کی وجد آفرینی ملی ' لیکن یہ موتیوں کی مالا ہروی فن‌کاروں کے ہاتھوں ٹوٹ گئی ۔ جب حافظ ' سعدی اور خواجوی کی نغمہ سرائی اس طرح ماند پڑی تو جامی اور ان کے رفقا کا دور ہرات میں مقبول ہوا اور اس کا اثر دور دور تک پھیلا ، لیکن کاغذی پھولوں میں مہک کہاں سے آتی ' خالی خولی تک بندی روایات کا ادراک تو نہیں ' وہ تو رسمی شاعری ہوئی ۔

اکبری دور کی ''تازہ گوئی'' گھوڑوں کے علاج پر منظوم رسالے لکھنے والوں کے خلاف ایک منظم احتجاج تھی ۔ ظہوری ' عرفی ' نظیری ' فیضی ' رسمی شاعری کے قائل نہ تھے ۔ ان کی شاعری کی جڑیں جذبات کی رنگا رنگی اور احساسات کی بوقلمونی میں تھیں ۔ انہیں تو اپنی روایات کی تشکیل و تکمیل کا احساس تھا ۔ وہ '' غزل عاشقانہ '' کی حدوں سے نکلنے سے گریز کرتے تھے کیونکہ جامی کا انجام ان کے سامنے تھا ۔ وہ اگر اس ''تنگنائے'' ، سے نکلتے بھی تھے تو صفویوں کے غالیچے اور قالین لپیٹ کر نکلتے :

گفت و گوے غم یعقوب بود پیشۂ ما
بوے پیراہن یوسف دہد '' اندیشۂ '' ما
در دل ما غم دنیا غم معشوق شود
بادہ گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما[۳]

غالب کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے ۔ اسے عرفی ، ظہوری ' نظیری وغیرہ کا نام گنا دینے کا چسکا نہیں ، وہ ان کی آواز کو پہچانتا ہے

اور ایک نعرۂ مستانہ مار کر ان کی صفوں میں کود جاتا ہے :

در پردۂ تو چند کشم ناز عالمے
داغم ز روزگار فراقت بہانہ ایست
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

شاعری کے لیے اکبری دور کے استعارے مقرر ہیں : چمن ، غنچہ ، بہار ، نغمہ ، ساز ، مے ، جام ، پیمانہ ، بادہ ، گوہر ، یہ سب غزلوں کے اشعار میں دنیاداری کی باتوں اور تنقیدی اصولوں کو شاعری بنا ڈالتے ہیں ۔ غالب کے ہاں بھی یہی پرانا نسخہ ہے ، اگرچہ انہوں نے انہیں عموماً نئے ڈھنگ سے استعمال کیا ہے اور فن شعر کے بارے میں شخصی تجربات کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے ۔

اسی طرح کی بعض اصطلاحیں غالب کے کلام میں آتی ہیں مثلاً : اندیشہ[۴] ، سوز و ساز ، معنی سرجوش ، فکر مضمون ، لفظ ، صورت ، معنی ، جو نظم میں کم اور نثر میں زیادہ ہیں ۔ نثر میں اکثر ان اصطلاحات کے استعمال میں غالب علم معانی و بیان کے معمولی اسباق اور بعض تذکروں کے عامیانہ جملوں کی سطح سے کبھی بلند نہیں ہوتے ۔ بلکہ یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید ریتر ک (Rhetoric) کی تمام بنیادی خرابیاں شاعری میں بھی ان کا پیچھا کرتی ہوں گی ۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ رقعات میں تنقیدی نظریوں والا غالب اشعار میں تنقید کرنے والے غالب سے مختلف معلوم ہوتا ہے ، بالکل ایسے ہی جیسے شاعر حالی ، نثار حالی سے زیادہ تنقیدی شعور رکھتا تھا ۔

اشعار میں غالب معانی و بیان کی توضیحات سے کم متاثر ہے کیونکہ وہ اپنے ذاتی تجربے اور ذاتی مشاہدے میں شاعرانہ تجربے

(Poetic Experience) کو پہچان لیتا ہے - زیادہ راہنمائی اسے اکبری دور اس کے بعد عالمگیری عہد کے شاعروں (خصوصاً بیدل) سے ملی - بیدل کے زمانے تک "تازہ گوئی" بقول غنی کاشمیری "تہ داری" کی حدوں میں داخل ہو چکی تھی[۵] - بال کی کھال اتارنے میں ایک پہلو منطقی ہے ، جس کی طرف غنی کاشمیری نے اشارہ کیا ہے ؛ لیکن اسی کا ایک پہلو جمالیاتی حظ کا بھی ہے ، جسے بیدل نے اپنے خاص اسلوب میں "پرطاؤس" قرار دیا ہے[۶] - غالب کا ابتدائی کلام اسی سے متاثر ہے - لیکن معانی و بیان سے کسی کو مفر نہیں - اس علم میں دو بڑی خرابیاں ہیں : جذبات کی پرداخت کے لیے کسی اصول کا موجود نہ ہونا اور شعر کی ظاہری شکل و صورت پر زیادہ توجہ - مؤخرالذکر رجحان غالب میں بھی پوری طرح کار فرما ہے - اس کی اصلاحیں عموماً لفظی تغیر و تبدل اور املا کے اغلاط کا احاطہ کرتی ہیں - خود اپنے کلام پر بھی اس کی اصلاحیں ایک بڑی تعداد میں پائی جاتی ہیں - غزل کی زبان کو چمکانے اور سنوارنے میں دیدہ ریزی (جسے غالب آرائش گفتار کہتا ہے) غالب کے لیے اس لیے بھی ضروری تھی کہ عمر بھر غالب کی وہ قدر نہیں ہوئی جس کا وہ خود کو مستحق سمجھتے تھے - کلکتے والے جھگڑے کے بعد تو احتیاط اور بھی ضروری تھی - اپنی شخصیت اور اپنی شاعری ، نرگسیت (Narcissism) کے سبب بہت اہم تھی اس لیے عروس زیبا کی طرح اس کی پرستش بھی ضروری تھی - اس کے لیے غالب کو بڑی کڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑا اور خود ان کے شعری نظریے میں بھی رخنے پڑے - (قتیل کے معاملے میں ان کی بوکھلاہٹ اس رجحان کو ظاہر کرتی ہے) -

ہر زمانے میں علم معانی و بیان کے ماہرین جذبات کی حد تک

پہنچنے کی کوششیں کرتے رہے ہیں اور بو علی سینا نے تو پانچ ظاہری حسوں (Senses) کے ساتھ پانچ باطنی حسیں بھی قائم کر دیں اور دماغ کے مختلف حصوں میں ان کے لیے الگ الگ جگہیں مقرر کر دی ہیں۔ یہ مضحکہ خیز صورت تھی لیکن اس سے ایک گیارہویں حس (الہام) کے لیے راستہ صاف ہو گیا۔ یہ راہ تصوف نے سجھائی تھی۔ اب شاعرانہ عمل کی بہت سی ناقابل فہم گتھیاں خود بخود سلجھ گئیں اور شاعری کو مقدس درجہ بھی مل گیا۔ کم و بیش سبھی شاعر اس الہامی حیثیت کو مانتے ہیں :

ہر ناوک اندیشہ کہ از شست کشادم
بر رہ‌گزر وحی، رہ افتاد کمیں را

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی
روح القدس اگرچہ مرا ہم‌زباں نہیں

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

غالب آزردہ سروشیست کہ از مستیٔ قرب
ہم بداں وحی کہ آوردہ غزل خواں شدہ است

شعر غالب نبود وحی و ندانیم ولے
تو و یزداں نتواں گفت کہ الہامے ہست

اس کا علاقہ اس سے کمتر لیکن مقدس اشیا کے ساتھ بھی ہے : کہیں شاعری سے ہے، کہیں اعجاز ہے، کہیں دم عیسیٰ، کہیں نخلۂ فردوس کہیں جام جم۔ غرض کہ تمام ارضی اشیا جو کسی نہ کسی طرح بھی کلاسیکی عظمت یا سماوی طہارت کا روپ

لے چکی ہیں وہ سب شاعری ہی کے مختلف نام ہیں^۸۔ اسے الہام کہیے یا مولانا آذری کے الفاظ میں ''ورائے شاعری چیزے دگر ہست'' کے نام سے یاد کیجیے۔ الہام کو شاعرانہ انسپریشن (Poetic Inspiration) کا مرکز مان کر حواس خمسہ کا قصہ تو کڈھب ہی رہتا ہے، کیونکہ مہیج تو ہر حال میں مادی ہی ہیں:

ہاں نشاط آمد فصل بہاری واہ واہ
پھر ہوا ہے تازہ سودائے ''غزل خوانی'' مجھے
وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہت گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری ''رنگیں نوائی'' کا
غالب امروز بہ وقتے کہ صبوحی زدہ ام
چیدہ ام این گل ''اندیشہ'' ز باغ دم صبح

ان مہیجات سے غالب ''آرائش غزل'' کرتا ہے لیکن صرف اسی پر بند نہیں:

ہزار زمزمہ دارم ہمیں نہ یک سخن است
کہ چوں تمام شود آں سخن ز سر گویم
ہم از فساد دل زار و داغ غم نالم
ہم از نزاع رگ جان و نیشتر گویم
زبانہ وار ز بانم شرر فشاں گردد
اگر براہ حدیث تف جگر گویم
شود رکاب تگاور در آب ناپیدا
اگر روانئ سیلاب چشم تر گویم

بکلبہ ام گہر شب چراغ خس ہوش است
سخن ز تیرگی طالع ہنر گویم
من آں نیم کہ بہ ہنگامۂ سخن سازی
گہے ز خاور و گاہے ز باختر گویم
سخن نہال نو و کہنہ باغباں غالب
نہال را بہ نوی مژدۂ ثمر گویم
طریق وادیٔ غم را کسے نبودہ رفیق
خود از صعوبت ایں راہ پر خطر گویم
دراں دیار کہ گوہر خریدن آئیں نیست
دکاں کشودہ ام و قیمت گہر گویم

غم زمانہ، غم عشق، زمانے کی ناقدری کا غم، فن کی بے حرمتی کا خیال — یہ اور ایسے ہی جذبات پر پرواز دیتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ یہ واقعات جس وقت پیش آئیں اسی وقت شعر بن جائیں۔ واقعات کا "خود خون بن جانا" شرط ہے، باقی وقت کی بات ہے:

ہے ناز مفلساں زر از دست رفتہ پر
ہوں گلفروش شوخیٔ داغ کہن ہنوز
ہوں گرمیٔ نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں
نازش ایام خاکستر نشینی کیا کہوں
پہلوے اندیشہ وقف بستر سنجاب تھا

بعض اوقات اس معجزہ کاری میں ایک کا غم دوسرے کے غم میں منتقل بھی ہو جاتا ہے :

''ایک میرا دوست اور تمھارا ہمدرد ہے - اس نے اپنے حقیقی بھتیجے کو بیٹا کر لیا تھا - اٹھارہ انیس سال کی عمر ، قوم کا کھتری ، خوبصورت ، وضعدار نوجوان ، ۱۲۷۳ ہجری میں بیمار پڑ کر مر گیا - اب اس کا باپ مجھ سے آرزو کرتا ہے کہ ایک تاریخ اس کے مرنے کی لکھوں ؛ ایسی کہ وہ فقط تاریخ نہ ہو بلکہ مرثیہ ہو کہ اس کو پڑھ کر رویا کرے - سو بھائی اس سائل کی خاطر مجھ کو عزیز اور فکر شعر متروک ؛ لہذا یہ واقعہ تمھارے حسب حال ہے[9] جو خوں چکاں شعر تم نکالو گے وہ مجھ سے کہاں نکلیں گے[10] ؟''

جس کے دل کو لگی ہو سوز و گداز کے شعر بھی وہی کہتا ہے اور اسی کے شعر با اثر ہوتے ہیں :

لکھتا ہوں اسد سوزش دل سے سخن گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پہ انگشت

ہے ننگ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو
ہے عار دل ، نفس اگر آذر فشاں نہ ہو
خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم
دل میں چھری چبھو ، مژہ گر خوں چکاں نہ ہو

شاعرانہ عمل دو طرح کا ہے ؛ ایک وہ جو عین موقعے پر فائدہ اٹھاتا ہے اور دوسرا وہ جو کبھی بعد میں اچانک در آتا ہے - یہی موخرالذکر فعل ورڈزورتھ کے نزدیک باز گشت (Retros-pection) ہے - نتیجہ تو ہر صورت میں ایک ہے - غالب اس راز

کو جانتا تھا ۔ اسے شعر کے اثر کا بہت خیال تھا ۔ یہ راستہ اس کی مجروح شخصیت نے اُسے دکھایا تھا ، اس لیے اس کے لیے یہ ممکن ہو گیا کہ وہ شاعرانہ عمل (Poetic Process) کے بارے میں احتیاط سے کام لے ، جذبات کی تہوں کو کھول کر دیکھے ، انہیں الٹ پلٹ کر ان کی نوعیت کا اندازہ کرے اور شاعرانہ تجربے (Poetic Experience) کی وسعت ، گہرائی ، تنوع اور ہمہ گیری کا جائزہ لے ۔ یہ کھٹراگ شعوری سطح پر آ گیا پھر خود شاعرانہ عمل کے مرکز توجہ بننے میں کون سی دیر تھی ۔ غالب مختلف زاویوں سے اُسے یوں جانچتا ہے :

ترک صحبت کردم و در بند تکمیل خودم
نغمہ ام جاں گشت و خواہم در تن ساز افگنم

نہ بندھے تشنگیٔ شوق کے مضموں غالب
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

در بادۂ اندیشہ ما درد نہ بینی
در آتش ہنگامۂ ما دود نیابی

ہنوز محرمیٔ حسن کو ترستا ہوں
کرے ہے ہر بنِ مو کام چشم بینا کا

نہیں گر سر و برگ ادراک معنی
تماشائے نیرنگ صورت سلامت

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

شاعرانہ عمل کی شعوری پرکھ کا اثر یہ ہے کہ غالب کے کلام میں تنوع اور رنگا رنگی آ گئی ہے۔ تجربات کے اظہار پر اس کی گرفت زیادہ مضبوط ہے۔ یہی چیز جذبے کو سمیٹ کر اکائی بناتی ہے۔ غالب کی زندگی میں ایسے موقعے کم آئے ہیں جب شاعرانہ تجربے کے سامنے وہ عاجز آیا ہو۔ جب جذبات انتہائی شدت کے ساتھ ہجوم کرتے ہیں اور تنقیدی نظر کے لیے 'الہام' کی رو میں سے انتخاب کرنا مشکل ہو جاتا ہے، ایسے موقعوں پر غالب کا دل بھی ڈول جاتا ہے۔ شاعرانہ فعل کی بڑائی اور عظمت کا یہ بڑا ثبوت ہے کہ شاعر کو بعض اوقات اپنی زندگی بھی داؤ پر لگانی پڑتی ہے:

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر "اندیشے" میں ہے
"آبگینہ" "تندیٔ صہبا" سے پگھلا جائے ہے

ہجوم "فکر" سے دل مثلِ موج لرزے ہے
کہ شیشہ نازک و صہبائے آبگینہ گداز

دردِ دل لکھوں کب تک، جاؤں ان کو دکھلاؤں
انگلیاں فگار اپنی، خامہ خوں چکاں اپنا

سخن چہ عطرِ شرر بر دماغ زد غالب
کہ تابِ عطسۂ "اندیشہ" مغز جانم سوخت

غبارِ طرفِ مزارم بہ پیچ و تابے ہست
ہنوز در رگِ "اندیشہ" اضطرابے ہست

بینم از ''گداز دل'' در ''جگر'' آتشے چو سیل
غالب اگر دم سخن رہ بضمیر من بری

اُسے احساس ہے کہ جذبے کی صداقت شعر کے اثر کی جان ہے اور اُسے نکھارنے ، سنوارنے اور چمکانے کے لیے کاوش کرنی پڑتی ہے ۔ ہمہ گیری اور گہرائی صداقت میں پوشیدہ ہے ۔ صداقت سے یہ مراد نہیں کہ اخلاقی معیاروں سے ہم ہر جذبے کو جانچنے لگیں بلکہ یہاں تو وہ سچائی درکار ہے کہ ''بر دار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت'' ۔ اتنا کافی ہے کہ ''فن کار'' ذہنی طور پر اس عذاب الیم میں سے گذر رہا ہو جس کا اظہار مقصود ہے ، ورنہ اس کے سوا تو سب کچھ یا ''مشق'' ہے یا ''قافیہ بندی'' :

غالب نبود شیوۂ ما ''قافیہ بندی''
ظلمے ست کہ بر کلک و ورق می کنم امشب

غالب سخن از ہند بروں بر ، کہ کس ایں جا
سنگ از گہر و شعبدہ ز اعجاز ندانست

این کہ افشارند و نم گیرند ''مشقے'' بیش نیست
ویں کہ خود خوں گردد و ریزد گدازے بودہ است

غالب کے ہاں شعبدہ اور اعجاز میں فرق ہے ؛ کیونکہ کہنے والے کے دل میں پیش کیے جانے والے جذبات موجود نہیں تو قاری پر ایسے اشعار کا اثر کچھ نہ ہوگا ۔ پہچاننے والی آنکھ جذبے اور مصنوعی جذبے میں فرق کر لیتی ہے ۔ اس کے لیے تو باریک تنقیدی نظر درکار ہے ۔ غالب کو یہ باریک بات شعر کے اثر پر غور کرنے سے ملی :

آفتاب عالم سر گشتگی ہاے خودم
می رسد بوے تو از ہر گل کہ می بوئیم ما

تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

اگر بباغ ز کلکم سخن رود غالب
نسیم روے گل از باغباں بگرداند

غالب کہ چرخ را بنوا داشت در سماع
امشب غزل سرود و مرا بے قرار کرد

لیکن جذبے کا اظہار بھی تو ایک کٹھن منزل ہے ۔ بڑے بڑوں کا پتا پانی ہو جاتا ہے ۔ اس میں محنت پڑتی ہے اور جگر کاوی کی ضرورت ہے[۱۱] :

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو

تازہ نہیں ہے نشۂ فکر سخن مجھے
تریاکی قدیم ہوں دود چراغ کا

ان منزلوں سے گزرنے کے بعد جب شعر شعر بن جاتا ہے ، تو قاری کے لیے وہ مقام آتا ہے جسے ٹریجڈی پر تبصرہ کرتے ہوئے ارسطو نے بوطیقا میں کتھارسز (Katharsis) کا نام دیا تھا ۔ غالب اپنے غم انگیز اشعار کی اس حیثیت کو جانتا ہے :

غالب ز کلک تست کہ یابم ہمی بدہر
مشکے کہ بر جراحت بند غم افگنم

غم لذتیست خاص کہ طالب بذوق آن
پنہاں نشاط ورزد و پیدا شود ہلاک

اس صبر آزمائی کا اجر اسے ضرور ملتا ہے - چراغ کی روشنی میں فکر سخن کرنے والا ، رسن تابیٔ آواز[۱۲] کا قائل ، گہرائیوں سے اپنے ڈھب کی چیزیں نکال لانے کا ڈھنگ جانتا ہے ، انہیں بناتا ہے ، سنوارتا ہے ، نکھارتا ہے اور اس عمل کو 'بالیدن' کے لفظ سے ادا بھی کرتا ہے :

اسد اٹھنا قیامت‌قامتوں کا وقت آرائش
لباس نظم میں بالیدن مضمون عالی ہے

تراش خراش میں لفظوں کی باریکیاں نکھرتی ہیں اور مفہوم کی وسعتیں بھی اجاگر ہوتی ہیں - اس کامیابی کا سبب یہ ہے کہ غالب معانی اور الفظ کو الگ الگ نہیں دیکھتا - جب شاہ نصیر اور ذوق کی بدذوقی (معانی کی غارت گری اور زبان کی حفاظت) چاروں اور پھیلی تو غالب کا "نوک پلک سنوارتے" ہوئے معانی کی طرف ڈنڈی مار جانا حیرت کی بات نہیں - وہ الفاظ کی صوتی اور جذباتی دونوں حیثیتوں سے واقف ہے[۱۳] - آخر دکانداری آسان نہیں - اپنا مال کھرا ثابت کرنے کے لیے انسان کو بڑے ہیر پھیر کرنے پڑتے ہیں اور دوسروں کو اپنا ہم خیال بنانے کی ضرورت بھی پیش آتی ہے :

اسد ارباب فطرت قدردان لفظ و معنی ہیں
سخن کا بندہ ہوں لیکن نہیں مشتاق تحسیں کا

ایسے میں داد کہاں سے ملتی - اس کی بجائے تو سزائے کمال سخن ملتی ہے[۱۴] گوہر خریدنے والے ناپید اور دکانداری کا چلنا محال ، لے دے کے تسکین کا سامان صرف اتنا رہ جاتا ہے :

کوکبم را در عدم اوج قبولے بودہ است
شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

حواشی

۱ - ذوق فکر غالب را بردہ ز انجمن بروں
با ظہوری و صائب محو ہمزبانیہاست

۲ - غالب دریں زمانہ بہر کس کہ وا رسی
''مضمون غیر''و''لفظ خودش'' بر زبان اوست
زیں مایہ از کجا کہ نبالد بخویشتن
ہر گنج شائگاں کہ بود رایگان اوست
کس را ز دست برد خیالش نجات نیست
گر پیش آزو گذشتہ و گر در زمان اوست
اما بہ کنہہ ''حسن ادا'' نا رسیدہ است
می لرزد از نہیب و دلم رازدان اوست
''مضمون شعر'' نوٹ بود فی زماننا
یعنی بدست ہر کہ بیفتاد آن اوست

۳ - یہ اشعار عرفیؔ شیرازی کے ہیں -

۴ - نہ کرسیٔ فلک نہد اندیشہ زیر پا
تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلاں زند
(ظہیر فاریابی)

۵ - می نماید سخنم سادہ ولے بے تہ نیست
از تہ چشمۂ آئینہ کسے آگہہ نیست
(غنی کاشمیری)

۶ - بفکر تازہ گویاں گر خیالم پرتو اندازد
پر طاؤس گردد جدول اوراق دیواں ہا
(بیدل)

۷ - اسد ہر جا سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگ بہار ایجادیٔ بیدل پسند آیا
مطرب دل نے مرے تار نفس سے غالب
ساز پر رشتہ پئے نغمۂ بیدل باندھا
مجھے راہ سخن میں خوف گمراہی نہیں غالب
عصائے خضر صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

۸ - رضواں کنند از ریزۂ کلکم بہ تبرک
پیوند گری ، نخلۂ فردوس بریں را
از رشک خوشنوائی ساز خیال من
مضراب نے بناخن ناہید بودہ است
غالب قلمت پردہ کشاے دم عیسیٰ است
چوں بر روش طرز خداداد بجنبد
صریر خامۂ من بیں کہ می رباید دل
چناں کہ از لب داؤد استماع زبور
صاف دردی کش پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ
وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

۹ - تفتہ کی اولاد نرینہ میں صرف ایک ہی لڑکا تھا پیتمبر سنگھ جو اس مکتوب کے لکھنے سے کچھ ہی دن پہلے ۱۸۵۵ء میں فوت ہو گیا ، اس کا مرثیہ دیوان تفتہ میں موجود ہے -

۱۰ - اُردوے معلیٰ ، مکتوب بنام تفتہ ، ص ۴۰ -

۱۱ - لیکن اگر نظر چوک جائے تو شعر ٹھیکرا بھی بن جاتا ہے :
شوق بے پروا کے ہاتھوں مثل ساز نادرست
کھینچتا ہے آج نالے خارج از آہنگ دل

۱۲ - بے مشقت نبود قید ، بشعر آویزم
روزکے چند ، رسن تابیٔ آواز کنم

۱۳ - گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

۱۴ - حسد سزائے کمال سخن ہے کیا کیجے
ستم بہا ے متاع ہنر ہے کیا کیجے